جدید تر شعری و ادبی رجحانات کا ترجمان
تمثیلِ نو
دربھنگا
سہ ماہی
ایڈیٹر: ڈاکٹر امام اعظم

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

جدید تر شعری و ادبی رجحانات کا ترجمان

تمثیلِ نو

سہ ماہی — دربھنگا

جلد : ۱

شمارہ : ۱

مارچ تا مئی ۲۰۰۱ء

زرِ تعاون — فی شمارہ ۱۰ روپے، سالانہ ۴۰ روپے، خصوصی تعاون ۲۰۰ روپے، لائف ممبری ۵۰۰ روپے

رابطہ — مدیر تمثیلِ نو، اردو ادبی سرکل، قلعہ گھاٹ، دربھنگا۔ ۸۴۶۰۰۴ (بہار)

پرنٹر پبلشر ایڈیٹر و اونر سید اعجاز حسن امام اعظم نے دربھنگا آفسیٹ پرنٹرز دربھنگا سے چھپوا کر دفتر تمثیلِ نو، فاروقی اورینٹل لائبریری، قلعہ گھاٹ دربھنگا سے شائع کیا۔ فون نمبر: ۳۵۱۱۷ (کوڈ ۰۶۲۷۲)

ترتیب

سارے جہاں میں دُھوم ہماری زباں کی ہے

ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو چکے ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا استقبال کرنے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ نئی صدی میں نئے نئے سماجی، سیاسی، معاشی اور اور معاشرتی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ ہمیں ان مسائل سے نبرد آزما بھی ہونا ہے اور انہیں حل بھی کرنا ہے۔ اب ہم کسی محدود معاشرہ کے بجائے ایک عالمی معاشرہ کے فرد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہمارے ادیب و فنکار خود کو نئے سانچے میں ڈھال رہے ہیں، نئے انداز اور زاویے سے سوچ رہے ہیں۔ اور اپنے ادب پارے میں نئے عالمی معاشرے کی تصویر کشی کر رہے ہیں کہ یہی وقت کا تقاضہ ہے لیکن اِس انداز کے ساتھ کہ ہم نہ تو ادبی روایات کو ہی فراموش کر سکتے ہیں اور نہ ہی نئے تقاضوں سے چشم پوشی کر سکتے ہیں۔

"تمثیل نو" کی پہلی پیشکش آپ کے سامنے ہے۔ اس کے مندرجات سے آپ کو خصوصیت کے ساتھ نئے ادبی رجحانات کے پیشِ نظر تخلیقی رفتار کا بھی اندازہ ہو سکے گا۔ ویسے ہماری خواہش یہ ہے کہ نئے ادبی تقاضے کے پیشِ نظر کچھ دیگر اہم ادبی موضوعات اور مسائل پر بھی مختلف مکتبۂ فکر کے قلم کاروں کی تحریریں آپ کے سامنے پیش کریں۔ اس سلسلے میں آپ کے مفید مشوروں کا انتظار رہے گا تاکہ ہم ان کی روشنی میں اگلے شمارہ کو خوب سے خوب تر بنا سکیں۔

اِس پر آشوب دور میں اردو کے ادبی جریدے شائع کرنا کوئی معمولی کام نہیں۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اُردو ادبی جریدے منظرِ عام پر لائے جاتے ہیں۔ بیشتر خطوط کے ذریعہ ان مدیران کی پذیرائی بھی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود کم ہی مدت میں ان جریدوں کی اشاعت کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس المیے کی وجہ سب کو معلوم ہے۔ فلمی اخبار اور جرائد وقتی اور سستی دلچسپی کی خاطر عوامی سطح پر خرید کر پڑھے جاتے ہیں کہ ان میں نئی تہذیب اپنی تمام نیرنگیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے اور نئی نسل کے ذہنی انبساط کا سامان فراہم کرتی ہے۔ لیکن ان کے مقابلے میں ادبی جرائد کی نکاسی کا تناسب بہت کم ہے جس کا ذکر ہی عبث ہے۔ اس کی بابت ہمارے اُردو کے ادیبوں، شاعروں

اور دانشوروں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ ادبی جریدے کی توسیع واشاعت کے تعلق سے ان پر بھی کچھ ذمّہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اگرچہ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ادبی سطح پر ایک ادیب یا شاعر کی بس یہی ذمّہ داری ہے کہ وہ اچھا لکھے لیکن کیا اِس حقیقت سے اِنکار کی گنجائش ہے کہ فن پارہ کو منظرِ عام پر لانے کے لئے ادبی جریدے کا زندہ رہنا بھی لازمی ہے۔ ویسے ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ آج دانشوروں کا ایک ایسا حلقہ موجود ہے جو شعر وادب کے فروغ کے لئے مالی تعاون کے ضمن میں بھی مخلص ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اُردو زبان وادب کا روشن مستقبل اسی کے دامن سے وابستہ ہے!

امام اعظم

"مابعد جدیدیت نہ ترقی پسندی کی ضد ہے اور نہ جدیدیت کی، اور چونکہ یہ نظریوں کی ادعائیت کو رد کرنے اور طرفوں کو کھولنے والا رویّہ ہے، اس کی کوئی بندھی ٹکی فارمولائی تعریف ممکن نہیں ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مابعد جدیدیت ایک کھلا ڈلا ذہنی رویّہ ہے تخلیقی آزادی کا، اپنے ثقافتی تشخص پر اصرار کرنے کا، معنی کو سکّہ بند تعریفوں سے آزاد کرنے کا، مسلمات کے بارے میں از سرِ نو غور کرنے اور سوال اُٹھانے کا، دبی ہوئی ادبی لیک کے جبر کو توڑنے کا، ادعائیت خواہ سیاسی ہو یا ادبی اس کو رد کرنے کا، زبان یا متن کے حقیقت کے عکسِ محض ہونے کا نہیں بلکہ حقیقت کے خلق کرنے کا، معنی کے معمولہ رخ کے ساتھ اس کے دبائے یا چھپائے ہوئے رخ کے دیکھنے دکھانے کا، اور قرأت کے تفاعل میں قاری کی کارکردگی کا۔ دوسرے لفظوں میں مابعد جدیدیت تخلیق کی آزادی اور تکثیریت کا فلسفہ ہے جو مرکزیت یا وحدیت یا کلیت پسندی کے مقابلے پر ثقافتی بوقلمونی مقامیت، تہذیبی حوالے اور معنی کے دوسرے پن 'THE OTHER' کی تعبیر پر اور اس تعبیر میں قاری کی شرکت پر اصرار کرتا ہے"!

پروفیسر گوپی چند نارنگ

پروفیسر شاکر خلیق، دربھنگا

مناجات

(ایک خاص کیفیت میں بہ یک نشست نصفِ شب تا آخرِ شب لکھی گئی)

حمدِ باری کا جب خیال ہوا ؛ کچھ بھی لکھنا مجھے محال ہوا
وصف مولا کا اور میرا قلم ؛ اس کو کس طرح آئے تابِ رقم
اے خدا فکر کو روانی دے ؛ ہر بُنِ مو کو زندگانی دے
شعر کو آب دار کر مولا ؛ فکر کو تاب دار کر مولا
نطق کو طاقتِ بیاں دے دے ؛ اور قلم کو مرے زباں دے دے
تو رحیم و کریم ہے مولا ؛ تو قدیم و حلیم ہے مولا
اس جہاں میں ہے رنگ و بو تجھ سے ؛ ہر طلب کو ہے جستجو تجھ سے
تو ہے آقا، غلام ہیں ہم لوگ ؛ پھر بھی بے ننگ و نام ہیں ہم لوگ
ناز ہے تو، نیاز ہیں ہم لوگ ؛ عاجز و جاں گداز ہیں ہم لوگ
ہو گیا عرصۂ حیات ہے تنگ ؛ حق و باطل میں ہو رہی ہے جنگ
ہر قدم پر زوال ہے مولا ؛ اب تو جینا محال ہے مولا
تیری چوکھٹ سے ہم کدھر جائیں ؛ کیا گوارہ ہے ہم بکھر جائیں
اے خدا ہم گناہ گار سہی ؛ سارے جگ میں ذلیل و خوار سہی
تیرے بندے ہیں ہم یہ کیا کم ہے ؛ پھر بھی دل کا چراغ مدھم ہے
تو جو چاہے تو کیا سے کیا ہو جائے ؛ مستجاب اپنی ہر دعا ہو جائے
لوح تیرا قلم بھی ہے تیرا ؛ جاہ تیری حشم بھی ہے تیرا
اپنے بندوں کو کامیاب بنا ؛ اپنے ذرّوں کو آفتاب بنا
رقص میں کائنات تجھ سے ہے ؛ وجد میں شش جہات تجھ سے ہے
تیرا پرتو جمالِ شمس و قمر ؛ تیری رحمت بہ شکلِ شاخ و ثمر
تیری قدرت کی جلوہ سامانی ؛ ہے کہیں آگ اور کہیں پانی

یہ زمیں تیری آسماں تیرا
کشتیٔ نوحؑ، بادباں تیرا

وقت تیرا زمانہ بھی تیرا
چرخ کا شامیانہ بھی تیرا

تو اگر ہم پہ مہرباں ہو جایے
یہ زمیں مثلِ آسماں ہو جایے

تیرے جلووں کا جال پھیلا ہے
ایک سے ایک مال پھیلا ہے

جب ہو جلووں کی اتنی ارزانی
کیسے نظروں کی ہو نگہبانی

حُسن کو تیرے کچھ زوال نہیں
تیرے شیشے میں کوئی بال نہیں

حُسن تیرا ہر ایک شئے سے عیاں
راز تیرا ہر ایک شئے میں نہاں

تیری قُدرت کا راز کُن فیکُون
تیرے ہی ذکر سے ہے دل کو سکون

تو ہمیں بامُراد کر مولا
اپنے بندوں کو شاد کر مولا

شاکرِ خستہ حال کی سُن لے
بے کس و پُر ملال کی سُن لے

اے خُدا تیری رحمتوں کی قسم
اے خدا دل کی حسرتوں کی قسم

جبر بھی قہر بھی ہے تیری صِفت
رحم تیری تو صبر میری صِفت

صبر کا میرے اِمتحان نہ لے
قسط میں اِس طرح سے جان نہ لے

زندگی گرچہ مستعار سہی
اور کم مایہ، کم عیار سہی

زندگی راحتوں کا نام نہیں
اس کو آسائشوں سے کام نہیں

زندگی نام گردشوں کا ہے
زندگی نام بندشوں کا ہے

زِندگی کم سواد ہے پھر بھی
کتنا بغض و عناد ہے پھر بھی

زندگی کو دوام گر ہوتا
اور اس کو قیام گر ہوتا

زندگی تلخ کام ہو جاتی
اور بے ننگ و نام ہو جاتی

زندگی ہے زوال آمادہ
تلخ ہے رُوزگار کا بادہ

تلخیٔ زیست پی رہا ہُوں مَیں
یُوں ہی جینے کو جی رہا ہُوں مَیں

زیست کو بامُراد کر مولا
ایک عاصی کو یاد کر مولا

اِس گنہگار پہ ہو چشمِ کرم
اپنے بیمار پہ ہو چشمِ کرم

کیا کمی ہے ترے خزانے میں
سب لگے ہیں مُراد پانے میں

بخش دے ہم گناہ گاروں کو
چھیڑ دے پھر سے دِل کے تاروں کو
رحمتوں کا نزول ہو جائے
یہ دُعا بھی قبول ہو جائے
جب بھی عاصی سے بھول ہو جائے
اور خاطر ملول ہو جائے
روزِ محشر مرا حساب نہ کر
اور گناہوں کا احتساب نہ کر
میرے آقا میری گرفت نہ کر
میری پُرسِش کا بندوبست نہ کر
ہے سیہ میرا نامۂ اعمال
پھر بھی لب پہ ہے بخششوں کا سوال
ابرِ رحمت جو جھوم کر برسا
عرشِ اعظم کو چوم کر برسا
دل کی کھیتی کو کر گیا سیراب
گلشنِ فکر ہو گیا شاداب
کر دے شاکرؔ پہ رحمتوں کا نزول
یہ مناجات ہو مری مقبول

مانیؔ فاروقی، کراچی

نعت پاک

آقائے نامدار کو اپنے میں کیا لکھوں
مُشکل کُشا کہ دافعِ ہر ابتلا لکھوں
نوکِ قلم پہ جس گھڑی آئے وہ اسمِ پاک
ہونٹوں سے اپنے چوم کے صَلِّ عَلیٰ لکھوں
تیرہ شبی میں مشعلِ روشن ہے ذاتِ پاک
لازم ہے اس لئے انہیں بدرالدجیٰ لکھوں
شہرِ مدینہ منبعِ دریائے نور ہے
وہ نور جس کو 'صاجو' نورِ خدا لکھوں
لمحہ بہ لمحہ آتی ہے دل سے یہی صدا
محبوبِ کردگار کو جانِ بقا لکھوں
اپنی شناخت کے لئے لکھنا ہے ایک لفظ
خادم لکھوں، غلام لکھوں، خاکِ پا لکھوں
جذبات کے ہجوم میں آنکھیں ہیں اشک بار
مانیؔ غمِ فراق کو آہ و بکا لکھوں

نوٹ:۔ مانیؔ فاروقی (غلام حسنین فاروقی) کا تعلق موضع علی نگر دربھنگا سے ہے!

مظہر امام، دہلی

دربھنگے میں اُردو ادبی صحافت

اب تک کی تحقیق کے مُطابق شمالی بہار میں سرزمینِ متھلا کے مشہور شہر دربھنگا سے اُردو کا پہلا ادبی جریدہ "مسیحا" کے نام سے ۱۹۰۴ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یعنی بیسویں صدی سے پہلے دربھنگے سے کسی روزانہ، ہفتہ وار یا ماہانہ اخبار یا رسالے کا سُراغ نہیں ملتا۔ "مسیحا" ایک ماہانہ رسالہ تھا۔ اور اس کے مدیر حکیم ابوالحسنات نامر دہلوی تھے۔ (یہ "انشائے لطیف" اور ماہنامہ "صلائے عام" والے خان بہادر میر ناصر علی دہلوی نہیں) وہ ۱۹۰۱ء میں دربھنگا آئے اور ۱۹۱۶ء تک وہیں محلہ قلعہ گھاٹ میں اپنا مطب کرتے رہے۔ خود طبیب تھے۔ مگر "مسیحا" کی مسیحائی دو سال سے زیادہ نہ کر سکے۔ اس دوران میں بھی رسالے کی صحت مشکوک رہی۔ کیوں کہ یہ رسالہ کبھی پابندیٔ وقت سے شائع نہیں ہُوا۔

تقریباً چوبیس سال کے صحافتی تعطّل کے بعد فروری ۱۹۲۸ء میں رضا منزل محلّہ شاہ سوبن دربھنگا سے ماہ نامہ "پروانہ" جلوہ گر ہُوا اور ۲۹ء تک شمعِ صحافت کا طواف کرتا رہا۔ اس کے بانی اور مالک سیّد محمد عبدُالقیّوم قتیلؔ (دربھنگوی) اور مدیر سیّد محمد طٰہٰ فکری اِلٰہی تھے جو مدرسہ حمیدیہ قلعہ گھاٹ میں نئے نئے مدرّس ہو کر دربھنگا آئے تھے۔ (سیّد محمد طٰہٰ فکری مشہور شاعر منظر شہاب کے والد تھے) کہا جاتا ہے کہ "پروانہ" کے ادارۂ تحریر سے کچھ دنوں کے لئے خبیر بہوروی بھی وابستہ رہے۔ اس کے خاص لکھنے والوں میں مُلّا رموزی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ جن کی "گلابی اردو" اُن دنوں عنفوانِ شباب سے گذر رہی تھی۔ آخری دور میں اس جریدے کی عنانِ ادارت ابوالنجم محمد قمرالدّین قمر اعظمی نے سنبھالی تھی۔ اور شاید اسی وجہ سے اُن دِنوں اس رسالے پر مذہبی رنگ غالب آ گیا تھا۔

۱۹۲۹ء میں دربھنگے کے افق سے "البدر" طلوع ہُوا اور کم و بیش ڈیڑھ سال تک اپنی کرنیں بکھیرتا رہا۔ اس نے "عید نمبر" اور "بدر نمبر" پیش کر کے اپنی صحافتی اہمیت کا احساس دِلایا۔ اس کے مالک و منیجر ایک مجنوں صفت اُردو دوست محمّد ہاشم تھے جنھوں نے اپنا ہاشمی پریس قائم کیا تھا۔ "البدر" کے مدیر مسئول سیّد محمد طٰہٰ فکری الٰہی تھے۔ ("پروانہ" میں نام سیّد محمد طٰہٰ فکری الٰہی ہے اور "البدر" میں سیّد محمد طٰہٰ الٰہی فکری) "البدر" ایک ہفتہ وار جریدہ تھا۔ اس میں سیاسی، سماجی، ادبی اور

مذہبی مضامین کو جگہ دی جاتی تھی۔

سنہ ۱۹۲۹ء ہی میں سید حفاظت علی فائق رزاقی نے ملکی چک، دربھنگا سے ایک ماہ نامہ "بشریٰ" کا اجرا کیا۔ لیکن اس کا ایک ہی شمارہ منظرِ عام پر آسکا۔ اس کے بعد اسی سال اسی جگہ سے سید حفاظت علی فائق رزاقی کی زیرنگرانی ایک دوسرا ماہ نامہ "آفتاب" طلوع ہوا۔ اور دو ماہ تک اپنی روشنی دکھاکر غروب ہوگیا۔ اس کے بعد پانچ سال تک دربھنگے کے صحافتی اُفق پر کسی جریدے کی روشنی نہیں اُبھری۔ "ماہ صفر المظفر سنہ ۱۳۵۳ھ" (یعنی مئی ۱۹۳۴ء) میں دارالعلوم احمدیہ سلفیہ کا ماہ وار رسالہ "مجلہ سلفیہ" لہیریا سرائے، دربھنگا سے شائع ہونا شروع ہوا۔ یہ ادبی کم، مذہبی زیادہ تھا۔ اس نے نسبتاً طویل عمر پائی۔ "ہمالہ" کی اشاعت کے وقت "مجلہ سلفیہ" زندہ تھا۔ اس کے مدیر سید عبدالحفیظ گیاوی تھے۔

ماہنامہ "ہمالہ" کا اجرا سنہ ۱۹۴۱ء میں ہوا۔ اس کی مجلسِ ادارت تین اصحاب پر مشتمل تھی ——— ش۔ منظر پوری، سید حسنین جامعی بی۔ اے اور عبدالعلیم آسی (بعد کے شماروں میں سید حسنین جامعی کی جگہ حسنین سید جامعی شائع ہوا ہے) ش منظر پوری اُن دنوں ۲۲۔۲۳ سال کے نوجوان تھے۔ لیکن بحیثیت افسانہ نگار اپنی شناخت بنانے لگے تھے۔ ان دنوں ان کی بسیار نویسی عروج پر تھی۔ انہیں "ہمالہ" کی ادارت کے لئے بطور خاص ان کے گاؤں سے بلوایا گیا تھا۔ سید حسنین جامعی جو بعد میں جماعت اسلامی بہار کے قیم بنائے گئے۔ جامعہ ملیہ کے گریجویٹ تھے اور رسالہ "جامعہ" کا "اقبال نمبر" ایڈٹ کرکے نام کما چکے تھے۔ عبدالعلیم آسی مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے فارغ التحصیل تھے۔ مسلم ہائی اسکول دربھنگا میں بحیثیت اُستاد احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ عربی اور فارسی ادب سے شغف رکھتے تھے۔ اقبالؔ اور جوشؔ کے رنگ میں شاعری کرتے تھے۔ خلوت میں ملحدانہ خیالات کا اظہار کرتے، جلوت میں سیرت النبیؐ پر تقریر فرماتے۔ بائیں بازو کی سیاست سے وابستگی کا بھی اعلان کرتے۔

"ہمالہ" کا دفتر محلہ باقر گنج، لہیریا سرائے میں تھا، جو شہر دربھنگہ کا ہی ایک حصہ ہے۔ اس رسالے کے مالک اعجاز نستوی تھے۔ موضع نستہ، ضلع دربھنگا کے رہنے والے۔ شعروادب کا رچا ہوا ذوق رکھتے تھے۔ عربی زبان وادب سے اچھی واقفیت تھی۔ اُردو میں ان کے لکھے ہوئے چھوٹے چھوٹے ادب پارے اور عربی افسانوں کے ترجمے "ادبی دنیا" لاہور میں شائع ہوئے۔ اپنے وقت کے لحاظ سے "ہمالہ" بڑی آب وتاب سے نکلا۔ لیکن اس کی زندگی چند روزہ نہ

سہی، "چند ماہہ" ثابت ہوئی۔ اس کا پہلا شمارہ جون ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ دوسرا جولائی میں تیسرا اگست ستمبر کا مشترکہ شمارہ تھا۔ کُل تین ہی شمارے منظرِ عام پر آئے۔ پہلے اور دوسرے شمارے میں ۶۴ اور تیسرے شمارے میں ۱۰۰ (سو) صفحات تھے۔

"ہمالہ" میں جن ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات شائع ہوئیں، اُن میں جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، مولانا آزاد سبحانی، جمیل مظہری، ش۔ مظفر پوری، سلام مچھلی شہری، ثاقب کانپوری، اختر قادری، نسیمہ سوز وغیرہ شامل ہیں۔ سید سلیمان ندوی کا مضمون "مسلمانوں کی آئندہ تعلیم" تین قسطوں میں رسالہ "جامعہ" سے نقل کر کے شائع کیا گیا ہے۔

"ہمالہ" کے آخری دنوں میں دربھنگے سے ایک اور ماہنامہ "حُسن و شباب" کے نام سے نکلا۔ یہ ستمبر ۱۹۴۱ء کا شمارہ تھا۔ اس کے ایڈیٹر مطیع الرحمٰن غوثی پیشے کے اعتبار سے خوش نویس تھے۔ اُنہوں نے رسالے کی تزئین و آرائش میں خاصا اہتمام کیا تھا۔ اس کی مجلسِ ادارت میں ڈاکٹر دہر ناصری بھی شامل تھے۔ مشتملات کا عام رنگ اس زمانے کے ہردلعزیز رسائل "مست قلندر" "حُسن پرست" وغیرہ سے مماثل تھا۔ اس کا ایک ہی شمارہ منصۂ شہود پر آیا۔

۴۲ء اور ۴۸ء کے درمیان شاید دربھنگے سے کسی نئے اخبار یا رسالے کا اجراء نہیں ہوا۔ البتہ مجلّہ سلفیہ باقاعدگی کے ساتھ نکلتا رہا۔ تقسیم ہند کے بعد اسی ادارے کی جانب سے ایک مذہبی پندرہ روزہ "الہدیٰ" کے نام سے نکلنا شروع ہوا۔ اس کی ادارت کے لئے مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی کو بلوایا گیا تھا۔ جو مدرستہ الاِصلاح سرائے میر کے فارغ التحصیل تھے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی انہیں کے چھوٹے بھائی تھے۔ پرواز اصلاحی کو ادارت کا سلیقہ تھا۔ نثر اچھی لکھتے تھے۔ ان کے اداریئے ادبی چاشنی کے باعث دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ ان کا قیام زیادہ دنوں دربھنگے میں نہیں رہا۔ بہت عرصے بعد مفتی صدر الدین آزردہ پر ان کی تحقیقی کتاب مکتبہ جامعہ بمبئی سے شائع ہوئی۔

جنوری ۱۹۴۹ء میں ایک معیاری ادبی رسالہ "نئی کرن" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کا مقام اشاعت امیر منزل، قلعہ گھاٹ دربھنگا تھا۔ رسالہ اپنے نقطۂ نظر کے اعتبار سے ترقی پسند ادبی تحریک کا ترجمان تھا جو اُن دنوں حکومتِ وقت کی نظر میں معتوب تھی۔ لہٰذا پولیس نے چھاپہ مارا اور "نئی کرن" کے پہلے شمارے کی کاپیاں اُٹھا کرلے گئی۔ حالانکہ رسالہ قطعی "بے ضرر" تھا۔ اس رسالے کی ادارت کے

فرائض راقم الحروف اور منظر شہاب انجام دیتے تھے۔ اسے اپنے وقت کے مقتدر لکھنے والوں کا تعاون حاصل تھا۔ جن میں کرشن چندر، فراقؔ گورکھپوری، آثر لکھنوی، جمیل مظہری، خلیل الرحمٰن اعظمی، فارغ بخاری، وشوامتر عادل، نریش کمار شاد، جمیل ملک وغیرہ شامل تھے۔ "نئی کرن" کے صرف تین شمارے لمبے لمبے وقفے پر (دوسرا شمارہ نومبر ۱۹۴۹ء میں اور تیسرا شمارہ فروری ۱۹۵۱ء میں) شائع ہوئے۔ لیکن اس نے ملک گیر سطح پر ادبی حلقوں میں بڑی شہرت حاصل کی۔

اس رسالے کے ساتھ ہی ساتھ یعنی مارچ ۱۹۴۹ء میں ماہ نامہ "صبح زندگی" کا بھی اجراء ہوا اس کے مالک محمد ہاشم تھے۔ جن کا ہاشمی پریس اُس وقت تک قائم تھا۔ یہ وہی محمد ہاشم تھے جنہوں نے ۱۹۲۹ء میں "البدر" کا اجراء کیا تھا۔ "صبح زندگی" کی ادارت کا کام انہوں نے اپنے صاحبزادے محمد سلطان احمد کے سپرد کیا تھا۔ رسالہ کئی ماہ تک باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ پھر بے قاعدگی آئی۔ اور سات آٹھ شماروں کے بعد بند ہو گیا۔ (محمد ہاشم مرحوم کی نواسی اور سلطان احمد کی بھانجی ڈاکٹر ریحانہ یاسمین (مرحومہ) تاج پور سمستی پور کے ایک کالج میں شعبۂ اردو میں ریڈر تھیں۔ اور شعر گوئی سے رغبت رکھتی تھیں) ۱۹۴۹ء میں ہی رسول پور، دربھنگا سے "سلام" کے غالباً دو شمارے سلمان ندوی کی ادارت میں نکلے۔

فروری ۱۹۵۳ء میں شمیم سیفی نے بنگالی ٹولہ لہیریا سرائے دربھنگا سے ایک ماہانہ رسالہ "افق" کا اجراء کیا۔ شمیم سیفی افسانے لکھتے تھے۔ مگر اس وقت ادب کی دنیا میں تقریباً نووارد تھے۔ بعد میں بہار کے افسانہ نگاروں میں معتبر ٹھہرے۔ اور ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "ایک ورق" کے نام سے شائع ہوا۔ وہ حکومتِ بہار کے لاسکریٹری بنے۔ اور ہائی کورٹ کے جسٹس کے عہدے پر فائز تھے کہ طویل علالت کے بعد مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ "افق" کے غالباً تین ہی شمارے منظرِ عام پر آئے۔ ایک طویل عرصہ کے بعد ۱۹۷۰ء میں ایک پندرہ روزہ "ہم اور آپ" شمیم سیفی شاکر خلیق اور شوکت خلیل کی ادارت میں شائع ہوا۔ جس کا صرف ایک ہی شمارہ منظرِ عام پر آسکا۔ "افق" کے بند ہونے کے بعد دربھنگہ کے صحافتی افق پر تاریکی کیا چھائی کہ کئی سال تک اس کے چھٹنے کے آثار نظر نہ آئے۔ حتیٰ کہ جون ۱۹۶۰ء میں سہ ماہی "رفتارِ نو" کا اجراء ہوا۔ یہ رسالہ بھی امیر منزل، محلہ قلعہ گھاٹ سے شائع ہوتا تھا۔ اسے ملک کے بہت سے بلند پایہ لکھنے والوں کا تعاون حاصل تھا۔ ترتیب میں خوش ذوقی اور سلیقے کا اثر نمایاں تھا۔ اس کے پانچ شمارے

بڑی حد تک باقاعدگی سے شائع ہوئے۔ اس کا آخری شمارہ جو جنوری ۱۹۶۲ء میں سالنامہ کی صورت میں شائع ہوا، بطور خاص اہمیت کا حامل تھا۔ اس میں لکھنے والوں کی تصویریں بھی چھاپی گئی تھیں۔ اُردو کی پہلی آزاد غزل اس شمارے میں شائع ہوئی۔ لکھنے والوں کا تعارف اور کتابوں اور رسالوں کے خاص نمبروں پر تبصرے اسی رسالے کی پہچان تھے۔ ملک گیر سطح پر "رفتارِ نو" کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ گذشتہ پینتیس ۳۵ سال کے دوران مجاز نوری نے "رفتارِ نو" یاد تازہ رکھنے کے لئے اس کے شاید دو تین شمارے بارہ بارہ چودہ چودہ سال کے وقفے پر شائع کئے ہیں۔ "رفتارِ نو" کا شمارہ ۶ اپریل ۱۹۷۶ء میں چھپا تھا۔ وہ کسی اور نام سے بھی ایک آدھ رسالہ چھپوا دیتے ہیں۔ جیسے "تحفۂ ادب" گذشتہ دنوں "ادب" کے نام سے بھی انہوں نے ایک رسالہ شائع کر دیا ہے۔

جن دنوں "رفتارِ نو" کا اجراء عمل میں آیا تھا۔ انہیں دنوں دربھنگے سے ہفتہ وار قومی تنظیم بھی نکلنا شروع ہوا تھا۔ کئی سال تک یہ ہفتہ وار پابندیٔ وقت کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ اس نے اپنے ادبی حصے کو بھی کافی دل چسپ بنا لیا تھا۔ اس میں کئی کارآمد مضامین شائع ہوئے۔ مثلاً آرزو جلیلی کے بارے میں محسن دربھنگوی کا مضمون، بابو اودھ بہاری پرشاد کے متعلق عبدالخالق خلیق کا مضمون۔ ۱۹۶۱-۶۲ء میں یہ ہفتہ وار اپنے عروج پر تھا۔ اس کے ایڈیٹر عمر فرید تھے۔ نہایت ہی فعّال اور معاملہ شناش۔ انہیں کئی ہونہار قلم کاروں کا تعاون حاصل تھا۔ بعد میں "قومی تنظیم" پٹنہ منتقل ہو گیا اور اب ایک مقبول اور ہر دلعزیز روزنامہ کی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔

"حلقۂ توازن" دربھنگا نے ایک نہایت ہی معیاری جریدہ "توازن" کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس کا ایک ہی شمارہ منظرِ عام پر آسکا۔ اس پر ع ۱ ۱۹۷۳ء درج ہے۔ لیکن اس کی اشاعت دراصل جنوری ۱۹۷۴ء میں ہوئی تھی۔ اس کے مرتب نجیب اختر تھے اور نگراں قمر اعظم ہاشمی۔ مجلسِ مشاورت میں مرتضیٰ اظہر رضوی، شمیم سیفی، لطف الرحمٰن اور شبیر احمد کے نام تھے۔ رسالہ سائز کے دو سو چالیس ۲۴۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ رسالہ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے قابلِ لحاظ تھا۔ اس شمارہ کے لکھنے والوں میں اجتبیٰ رضوی، جاں نثار اختر، غلام ربانی تاباں، فضا ابن فیضی، ڈاکٹر محمد حسن، پروفیسر عبدالمغنی، ڈاکٹر ابن فرید، ڈاکٹر احمد سجاد، ذکی انور، لطف الرحمٰن، شاکر خلیق، مظفر حنفی، ندا فاضلی، سلطان اختر، ساجدہ زیدی، پروفیسر اختر قادری، حرمت الاکرام، شوکت حیات، شمیم سیفی، شفیع مشہدی، راقم الحروف وغیرہ شامل تھے۔

۱۹۷۸ء میں بہیڑہ ضلع دربھنگہ سے شمس شادمانی اور نقی امام کی ادارت میں ایک ڈائجسٹ "کردار" کے نام سے شائع ہوا۔ اور پوہدی بیلا دربھنگہ سے مولوی عبدالمنان صاحب کی ادارت میں ماہ نامہ "اشرف العرفان" عرصہ تک نکلتا رہا۔

آچاریہ شوکت خلیل نے من سکھ نگر، اکی، دربھنگا سے پندرہ روزہ "آگ کا دریا" ۱۹۸۴ء میں بڑے ہی اہتمام سے نکالا۔ اور اس کے کئی شمارے منظرِ عام پر آئے۔ اور اس کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی بھی ہوئی۔ لیکن کسی وجہ سے اس کی اشاعت بند ہو گئی۔ پھر ایک وقفے کے بعد ۱۹۸۹ء میں اس کا اجراء دوبارہ عمل میں آیا۔ اور دو تین شمارے کے بعد بند ہو گیا۔ اسی عرصے میں دربھنگے کے ملا حلیم خاں محلے سے ہفت روزہ "جدید سلسلۂ جنگ" مطیع الرحمٰن نعمانی کی ادارت میں باقاعدگی سے کئی سالوں تک نکلتا رہا۔

کئی برسوں کے وقفے کے بعد ۱۹۹۷ء میں موضع لوام، دربھنگا سے ڈاکٹر نذیر انجم کی ادارت میں ماہ نامہ "آوازِ نو" نکلنا شروع ہوا۔ جو اب تک پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اور ادبی حلقوں میں اپنی پہچان بنا چکا ہے۔ اس دوران میں اس سرزمین سے کئی نئے اور ہونہار لکھنے والے اپنی نگارشات کے ذریعے اپنی پہچان بنا رہے ہیں۔ ان میں کئی نئے لکھنے والوں کی کتابیں بھی منظرِ عام پر آ گئی ہیں۔ اور ادبی دنیا میں ان کا خیر مقدم کیا گیا ہے۔ لیکن کوئی ایسا رسالہ نہیں ہے جو بالکل نئے لکھنے والوں کے ذوق کو مزید مہمیز دے سکے۔ دیکھنا ہے:

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
بھاگلپور۔

ایک لہر ـــــ نئی نئی

بدلتے ہوئے وقت اور زندگی کی رفتار کے ساتھ شعر و ادب کے رنگ و روپ میں بھی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ کیوں کہ تبدیلیاں ادب کے لئے نئے دریچے وا کرتی ہیں۔ اور ادب بہر حال وقت اور زندگی کا عکاس ہوتا ہے۔

اردو ادب میں ایک ذہین، حساس اور باشعور نسل رفتہ رفتہ سامنے آرہی ہے، اور آچکی ہے جو تحقیق، تنقید اور تخلیق تینوں سطحوں پر تازہ دم اور حوصلہ مند ہے۔ یہ نئی ٹیپ ماضی کے صحت مند اقدار کی بازیافت، حال کے ہمہ جہت عرفان اور مستقبل کی روشن سمت کے لئے مصروف ریاضت ہے۔

یہ نسل ترقی پسند مکتبۂ فکر اور جدیدیت کے رجحان سے منحرف ضرور ہے۔ لیکن اس کے سامنے تیسری دنیا تک جانے کے راستے نظر نہیں آرہے ہیں۔ لاشعوری طور پر یہ نسل ترقی پسندی کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یہ اپنا اثبات چاہتی ہے اور ضرور چاہتی ہے۔ لیکن فطری عمل کے راستے ان کے سامنے مسدود ہیں۔ مابعد جدیدیت تک ان کی ذہنی رسائی نہیں ہے۔ جبکہ اس کے لئے کوششیں جاری ہیں۔

حالانکہ لہریں ہر زمانہ میں اُٹھتی رہی ہیں۔ اور دس بیس سال کے عرصے میں جو اعلیٰ، معیاری اور اچھی تخلیقات سامنے آئی ہیں وہ ادب کا حصّہ بنتی رہی ہیں۔ بقیہ چیزیں خس و خاشاک بن کر خود بخود لہروں میں بہہ گئی ہیں۔

نئی نسل اکابرین ادب کے لئے خطرہ کبھی نہیں بنتی ہے بلکہ موجود رجحانوں سے انحراف کرکے اس میں اضافہ کا باعث بنتی رہی ہے اور یہ ہونا بھی چاہیے۔ ورنہ ادب یکسانیت اور بوریت کا شکار ہو جاتا ہے۔

جہاں تک تنقید کی بات ہے نئی نسل میں غیر معمولی دھار دار تنقیدی مکاشفہ نظر آتا ہے جو نہایت فکر آموز اور معنی خیز کردار کا حامل ہے۔ آج ضرورت اس کی ہے کہ نئے عہد کے تخلیقیت افروز تنقیدی جہات کو ایک فلیش میں روشن کرنے کے لئے پلیٹ فارم

مِل جائے، صحیح راستے کی نشان دہی ہو جائے، مسدود راستے کشادہ ہو جائیں تاکہ نئے تنقیدی اُبھار کے مثبت اور توانا اثرات اکیسویں صدی پر محیط ہوں۔ اپنے عہد میں ان کی دید دیافت کے لئے غیر معمولی تخلیق اور تنقیدی ویژن درکار ہے جو نئی نسل میں وافر موجود ہے۔

نئی نسل جس سمت میں بڑھنا چاہ رہی ہے اس کی بوطیقا تخلیقیت پسند ادب کے جمالیاتی اور اقداری نظام کی شکل میں رُونما ہو چکی ہے۔ اور ایک واضح اور سورنج آسا شناخت سامنے آیا ہے جو ترقی پسندی اور جدیدیت سے الگ ہے۔ یہ مابعد جدیدیت سے نئے عہد کی تخلیقیت تک کا احاطہ کرتی ہے اور نئے تخلیقیت پسند ادب کی تفہیم اور تعین قدر کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ جبکہ جدیدیت پسند تنقید یک رُخی، گروہ بند، انتہاپسند، عدم توازن کی قتیل ہے۔ وہ بدلتے ہوئے تناظر کے اصول وقت سے قطعی ہم آہنگ نہیں رہی ہے۔ اسی لئے اس کی یکسانیت اور تقلیدیت گزیدگی ناخوشگوار اور گردن زدنی بن گئی ہے۔ اس کے مقابلے میں اور اس سے آگے کا سفر طے کرتے ہوئے آج ناطرفدار تخلیقیت ماضی کے زندہ، متحرک اور نامیاتی اقدار کی بازیافت، حال کے ہمہ جہت عرفان اور مستقبل کی روشن جہتوں کی تلاش مدام تلاش میں کوشاں ہے۔ یہ تحقیق، تنقید اور تخلیق ہر سطح پر DICTATION (تلقینیت گزیدگی) اور IMITATION (تقلیدیت گزیدگی) کی دشمن ہے۔ یہ حرف نئے، تصور وقت کے مطابق تازہ دم اور حوصلہ مند CREATION کی امین ہے جو ہر سطح پر نئے عناصر کو تلاش کر کے ہمہ دم تخلیقیت افروز، تخلیقیت پرور اور تخلیقیت کوش ہوتی ہے

مَیں ایک بار پھر زور دے کر کہنا چاہوں گا کہ آج نئی نسل کے ناقدین رونما ہو چکے ہیں اور آج کا ادب نئے تناظر کے نئے اصول وقت (REALITY PRINCIPLE) کے مطابق رد پذیر ہو چکا ہے اور اس کی تفہیم اور تعین قدر کے لئے تخلیقیت افروز، تنقیدی بوطیقا بھی وجود پذیر ہو چکی ہے۔ جدید تر نسل تنقید اور تخلیق کے ضمن میں نئی تنقید، اسطوری تنقید، اسلوبیات، ساختیات، پس ساختیات اور رد تشکیل سے بہت آگے، جدیدیت کے سوال کا جواب "ناطرفدار تخلیقیت" کے رُوپ میں

مسکت طور پر دے چکی ہے جو محض اِنفرادیت اور جمالیت گزیدہ یک جہتی کے بجائے جمالیاتی، اخلاقی اور رُوحانی ہمہ جہتی، تہذیبی مرکزیت کشی کے بجائے تہذیبی مرکزیت جوئی اور عارفانہ وجودیاتی وژن ONTOLOGICAL VISION کی امین ہے یہ ہر سطح پر HOLISTIC AWARENES SENSITIVITY کی معراج اور آفاقی ہوش مندی اور حسیت کی امین ہے۔ یہ ادبی تنقید کی خاص ڈسپلن کا اصرار کرتے ہُوئے بھی صاف طور پر تاکید کرتی ہے کہ ادب میں سنجیدہ دِل چسپی عملی تنقید کے نام سے حرف ملفوظی اور مکتوبی پیکروں، علامتوں اور استعاروں کے مطالعہ تک ہی اپنے آپ کو محدود نہیں رکھ سکتی۔ حقیقی ادبی دل چسپی کا مطلب آدمی، سماج، تہذیب، زندگی، فِطرت اور خدا میں دل چسپی ہے۔ یہاں تک کہ اس کی کوئی حدبندی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ادب کے کائنات اکبر (MACRO STRUCTURE) اور کائنات کا اصغر (MICRO STRUCTURE) دونوں کو مساوی طور پر اہمیت دیتی ہے اور ہر دم نئے جمالیاتی اور اقداری جہات والعاد کے خوب سے خوب تر گوشوں کی تلاش میں مدام کوشاں رہتی ہے۔ یہ حرف آخر کو پروانۂ موت تصوّر کرتی ہے۔ یہ ابدیت کے صفحہ پر خدا کا دستخط ہے

آج نئی نسل کا مسئلہ نقاد پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ ناطرفدار تخلیقیت کو اپنانا ہے کیوں کہ یہ فطری عمل ہے۔ جب کچھ لکھا جائے گا تو ادب کہلائے گا اور اسے پڑھنے والے ضرور پڑھیں گے اور نقّاد کبھی نہیں چاہتے ہُوئے متوجّہ ہوں گے۔ اصل اور بنیادی بات ہے، پلیٹ فارم اور راستے کا کھُلاپن!

رؤف خیر، حیدر آباد

بچوّں کا اقبال

مناسب الفاظ کو مناسب جگہوں پر استعمال کرنے کا ہنر ہی شاعر اور ادیب کی ایک شناخت قائم کرتا ہے۔ اسی طرح مناسب رنگوں کا مناسب خطوط کے لیے برتنا ہی ایک فنکار کو حقیقی معنوں میں فن کار بناتا ہے۔ اقبال کو جب ہم اس تناظر میں دیکھتے ہیں تو اقبال کی قدآوری کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں بچوّں کے لئے بچوّں کی سطح پر اتر کر سلیس پیرایۂ اظہار اختیار کرنا کس قدر مشکل کام ہے اور اقبال جیسے بے انتہا پڑھے لکھے WELL-VERSED آدمی کے لیے یہ کچھ زیادہ مشکل کام ہو جاتا ہے۔ کیونکہ جو آدمی محدود علمیت کا حامل ہو اس کی حدود متعین کی جاسکتی ہیں جبکہ اقبال کسی دائرے میں قید نہیں کئے جاسکتے۔ وہ نہ صرف اردو ادب کے ماضی وحال سے کماحقہٗ واقف تھے بلکہ ان کی نظر فارسی انگریزی، سنسکرت اور جرمن ادب پر بھی بڑی حد تک تھی۔ اس منزل پر پہنچ کر اقبال اگر بچوّں کے لئے بچوّں کی زبان میں سلیس پیرایہ اختیار کرتے ہوئے چھوٹے چھوٹے موضوعات پر بڑی اہم بات کر جاتے ہیں تو یہ اقبال ہی کا حصّہ ہے۔ اقبال سے ایک ذرا پہلے اسمٰعیل میرٹھی خاص طور پر بچوّں کے لئے بہت خوبصورت نظمیں لکھ رہے تھے۔ اقبال کو ایک سہولت یہ حاصل تھی کہ ان کے سامنے انگریزی ادب کی بے شمار نظمیں تھیں جن سے اردو ادب کو روشناس کرایا جاسکتا تھا چنانچہ اقبال نے ان نظموں سے استفادہ کیا۔ اقبال کی بیشتر نظمیں جو بچوّں کے لئے لکھی گئیں وہ انگریزی ادب سے ماخوذ ضرور ہیں مگر ان میں جو آب و روغن ہے وہ خالص مشرقی انداز کا ہے۔ اقبال کی بڑائی ہے کہ انہوں نے ان نظموں کے ماخذ کی نشان دہی کردی ورنہ ان اردو نظموں کا انگریزی نظموں سے تقابل کرنا دشوار ہی ثابت ہوتا۔ مثلاً اقبال کی اک نظم "بچے کی دعا" ہے اس کو اقبال نے ماخوذ قرار دیا ہے اس پر ہر چند کہ شاعر کا نام درج نہیں ہے مگر تحقیق کرنے پر کھلا کہ یہ دراصل میٹلڈا بیتھم (METILDA BETHAM) کی نظم A CHILD,S - HYMN کے خیال سے اٹھائی ہوئی ہے۔ مگر اردو میں آکر اس نے جو رنگ اختیار کر لیا وہ خالص مشرقی بلکہ اسلامی ہے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری　　زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دُور دُنیا کا مرے دَم سے اندھیرا ہو جائے　　　ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے

میرے اللہ بُرائی سے بچانا مجھ کو　　　نیک جو راہ ہو اُس رَہ پہ چلانا مجھ کو

نیک رستے کی دُعا وہی کر سکتا ہے جس کے رگ و ریشہ میں اِھدِنا الصِّراطَ المستقیم کی دُعا رچ بس گئی ہو۔

بچّوں کے لیے اقبال کی پہلی نظم جو بانگِ درا میں ہمیں ملتی ہے وہ ہے ایک مکڑا اور مکھی۔ یہ دراصل میری ہاوٹ (MARY HOWITT 1799-1888) کی انگریزی نظم "THE SPIDER AND THE FLY" سے ماخوذ ہے۔

اِک دن کسی مکھی سے یہ کہنے لگا مکڑا　　　اِس راہ سے ہوتا ہے گزر روز تمہارا

لیکن مری کُٹیا کی نہ جاگی کبھی قسمت　　　بھولے سے کبھی تُم نے یہاں پاؤں نہ رکھا

اور مکھی اسے صاف جواب دے جاتی ہے:

اِس جال میں مکھی کبھی آنے کی نہیں ہے　　　جو آپ کی سیڑھی پہ چڑھا پھر نہیں اُترا

لیکن یہاں سے نظم اِک نیا موڑ لیتی ہے۔ شاعر بتاتا ہے کہ کس طرح خوشامد سے سَو کام نکلتے ہیں۔ مکڑا بڑی صفائی سے مکھی کے حُسن کی تعریف شروع کرتا ہے۔

آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں　　　سَر آپ کا اللہ نے کلغی سے سجایا

یہ حُسن یہ پوشاک یہ خوبی یہ صفائی　　　پھر اس پہ قیامت ہے یہ اُڑتے ہوئے گانا

اس کے بعد مکھی کا جو حشر ہونا تھا سو ہوا۔ اقبال اس نظم کے ذریعہ جہاں یہ کہتے ہیں کہ خوشامد سے سَو طرح کے کام نکالے جا سکتے ہیں وہیں ایک دُوسرا اور بڑا اہم درس وہ یہ بھی دیتے ہیں کہ خوشامدی بہر حال اپنے ممدوح کو ظلِّ الٰہی ظلِّ سُبحانی یا شہنشاہِ عالم کہہ کہہ کر ان شہنشاہِ عالم کی دسترس از دِلّی تا پالم ہی کیوں نہ ہو) لُوٹتے ہیں۔

اقبال جانتے تھے کہ خودی کا درس دینے کے لئے کچّے ذہن زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور اس کے لیے ان کو انہی کی زبان میں خودی کی اہمیت دکھائی جائے۔ خودی کا یہ درس ممکن ہے اقبال نے شعوری طور پر دیا ہو مگر آج ہم سوچتے ہیں تو یہ اقبال کی دُور اندیشی نظر آتی ہے۔ ہر چند کہ بات غیر کے حوالے سے سہی اقبال کی بات اِس طرح پہنچ تو جاتی ہے۔ نظم ایک پہاڑ اور گلہری پر ماخوذ از ایمرسن لکھا ہُوا ہے یہ دراصل ایمرسن کی نظم THE MOUNTA-IN AND THE SQUIRREL سے اُٹھایا ہُوا خیال ہے۔

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
کہ تیری بساط ہے کیا میری شان کے آگے

گلہری اسے جواب دیتی ہے :-

بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اس نے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اس نے

جو تو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیہ ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

اس نظم میں اک درس خودی ملتا ہے۔ گلہری کی خودی پہاڑ سے کمتر نہیں اور یہ بات اگر بچے کے ذہن نشین ہو جائے تو وہ مستقبل کا بہت بڑا آدمی بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس خودی کی تربیت کرے۔ اقبال شعوری طور پر بچے کو قدآوروں سے آنکھ ملانا سکھاتے ہیں۔

اسی تربیت کو آگے بڑھاتی ہوئی اقبال کی اک اور نظم "ہمدردی" ہے جو ولیم کوپر WILLIAM COOPER کی نظم (NIGHTIN GALE AND THE GLOW - WORM) سے ماخوذ ہے۔

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا
بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا

کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی
اڑنے چگنے میں دن گزارا

پہنچوں کس طرح آشیاں تک
ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا

سن کر بلبل کی آہ و زاری
جگنو کوئی پاس ہی سے بولا

حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے
کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا

کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری
میں راہ میں روشنی کروں گا

اللہ نے مجھ کو دی ہے مشعل
چمکا کے مجھے دیا بنایا

پھر آخر میں فیصلہ سنیئے۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

کوئی چیز بجائے خود بڑی حقیر ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ بڑے کام کی بھی ہو سکتی ہے اور پھر جہاں جذبۂ ہمدردی بھی شامل ہو تو پھر تو اس کا چھوٹا پن، چھوٹا پن نہیں رہ جاتا۔

اقبال کی اپنی کوشش یہ لگتی ہے کہ نئی نسل میں وہ تمام اعلیٰ صفات پیدا ہوں جو ایک انسان کامل کے لیے ضروری ہیں۔ اس طرح اقبال نے بچوں کو محض کھلونے دے کر بہلانے کی کوشش

نہیں کی بلکہ انہیں زمانے کا نرم و گرم سمجھایا ہے اور اس زندگی میں ان کی اہمیت کو اُجاگر کیا ہے۔

اِک اور نظم "ایک گائے اور بکری" پر بھی حرف ماخوذ لکھا ہُوا ہے۔ یہ دراصل جین ٹیلر JANE TAYLOR کی انگریزی نظم (THE COW AND THE ASS) سے استفادہ ہے۔ اقبال کی جمالیات نے گدھے کو قبول نہیں کیا۔ انہوں نے اسے بکری کا رُوپ دے دیا۔ اور نظم کو کافی بدل دیا۔ گدھے کی جگہ بکری کی خصوصیات کے حوالے سے اِک اہم بات کہی گئی ہے۔ گائے کے گِلے کے جواب میں بکری اُسے سمجھاتی ہے ؎

لُطف سارے اسی کے دَم سے ہیں	یہ مزے آدمی کے دَم سے ہیں
دِل کو لگتی ہے بات بکری کی	یُوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی

اِس نظم میں بھی اقبال اپنے مَنصب سے ہٹتے نظر نہیں آتے۔ یہاں بھی کائنات میں اِنسان کی اہمیت کا اِحساس دِلاتے ہیں۔

ان نظموں کے علاوہ "ماں کا خواب" اقبال کی وہ نازک اِحساسات پر مبنی نظم ہے جو یُوں تو (W. BARNES) بارنس کی نظم THE MOTHERS DREAM سے استفادہ ہے مگر اقبال اس نظم میں بھی داخل ہیں۔ صبرِ جمیل کی تلقین اور اس قدر ڈرامائیت کے ساتھ اقبال ہی کر سکتے تھے۔ ماں اپنے مرحوم لڑکے کے غم میں اکثر روتی رہتی ہے اور ایک رات اس کو خواب میں دیکھتی ہے اسے مَلال یہ ہوتا ہے کہ اس کے نورِ نظر کے ہاتھوں میں جو دیا ہے وہ جلتا دکھائی نہیں دیتا۔ لڑکا اسے اس کا سبب بتاتا ہے۔

ترے آنسوؤں نے بُجھایا اسے	سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے

ہر چند کہ یہ نظم بارنس کی نظم سے ماخُوذ ہے۔ مگر "ماں" کی جو حیثیت مشرق میں ہے وہ طے ہے کہ مغرب میں نہیں۔ اس نظم کا اُردو ادب میں بلکہ مشرقی شعریات میں جو مقام ہے اس کے پیشِ نظر اس کا صحیح لُطف تو یہیں اُٹھایا جا سکتا ہے۔ ہماری مائیں کِس قدر دَرد بھرے دِل کی مالک ہوتی ہیں یہ ہم بخوبی جانتے ہیں۔ انہیں صَبر کی تلقین کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ مگر چھوٹے بچے کے حوالے سے اقبال مشرقی ماں کے آنسو پونچھتے ہیں۔

اقبال کے اسلوب کی ایک اور شاہکار نظم "پرندے کی فریاد" ہے۔ جو خالص طبع زاد نظم ہے اور یہ ماخوذ ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ کیوں کہ اس نظم میں جو المیہ بیان کیا گیا ہے وہ تو لبس ہندوستانی

پس منظر ہی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ پرندے کی علامت اور پھر پرندے کی رعایت سے آشیانہ، قفس چمن اور اس کے دیگر لوازمات دراصل آزادی کی جدّ وجہد یا آزادی کی خواہش اور حصُول کا پس منظر لیے ہُوئے ہیں۔ اِس نظم میں اقبال نے اس دَور غلامی کی عکّاسی بڑے دَرد انگیز لہجے میں کی ہے۔

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہُوا زمانہ　　وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا

اِس قید کا الٰہی دُکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں غم سے مَر نہ جاؤں

اور پرندہ آخر کار اپنے صیّاد سے گزارش کرتا ہے :-

آزاد مجھ کو کردے او قید کرنے والے　　مَیں بے زباں ہُوں قیدی تو چھوڑ کر دُعا لے

اِس نظم میں پرندہ ایک انسا وادی نظر آتا ہے۔ انسا وادی ہونا بھلے ہی اس کی مجبوری تھی صیّاد کے جذبہ ترحم کو للکارنا بھی ایک آرٹ ہے۔ اور اس نظم میں یہ آرٹ اپنے دَور کی عکّاسی کرتا ہُوا ہے اور عروج پر ہے

اقبال کی اِک نظم "طفلِ شیر خوار" کا ذکر کئے بغیر میری بات ادھوری رَہ جائے گی۔ ہر چند کہ اس نظم پر کہیں یہ لکھا ہُوا نہیں ہے کہ یہ بچّوں کے لئے ہے۔ مگر ایسے لگتا ہے کہ جو بچّہ اقبال کی ابتدائی نظموں میں پایا جاتا تھا وہ ابھی سنِ شعور کو پہنچا اِن کی یہ عین تمنّا ہے کہ وہ اسے ہتھیاروں سے کھیلنے سے باز رکھیں۔ نظم یُوں شروع ہوتی ہے۔

مَیں نے چاقو تجھ سے چھینا ہے تو چلّاتا ہے تو　　مہرباں ہُوں مَیں، مجھے نامہرباں سمجھا ہے تو

پھر پڑا روئے گا اے نووارد اقلیم غم　　چُبھ نہ جائے دیکھنا باریک ہے نوکِ قلم

آہ کیوں دُکھ دینے والی شئے سے تجھکو پیار ہے　　کھیل اس کاغذ کے ٹکڑے سے یہ بے آزار ہے

آگے چل کر شاعر اس طفل شیر خوار کو سمجھاتے ہُوئے جو بات کہتا ہے وہیں سے نظم اِک عجیب وغریب موڑ لیتی ہے۔ فلسفے کی ایک دُنیا اس چھوٹی سی نظم میں سموئی ہُوئی ہے۔ دُنیا کی ظاہری چمک دَمک اور اس کی بے ثباتی کا جس خوب صُورت لہجے میں اقبال نے ذکر کیا ہے اور اپنی نادانی کا جو اعتراف کیا ہے اس پر ہزار دانائی قُربان۔

میری آنکھوں کو لُبھا لیتا ہے حسنِ ظاہری　　کم نہیں کچھ تیری نادانی سے نادانی مری

تیری صُورت گاہ گریاں گاہ خنداں میں بھی ہُوں　　دیکھنے کو نوجواں ہوں، طفل ناداں مَیں بھی ہُوں

اقبال کی اس نادانی نے انھیں دانائی کی اس منزل پر پہنچا کر دم لیا جہاں فرشتوں کے پَر جل جاتے ہیں۔

اقبال اس بات کے قائل تھے کہ دانائی و فراست کی بات مومن کا کھویا ہوا خزانہ ہے لہٰذا ادبیات عالم سے استفادے کو انہوں نے کبھی عار نہ جانا۔ حتیٰ کہ اپنے پیش رو شاعر اسمٰعیل میرٹھی کی مشہور زمانہ نظم "بارش کا پہلا قطرہ"

گھنگھور گھٹا تلی کھڑی تھی
پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی

کو اقبال نے نئی زندگی بخشی، اسے انہوں نے "قطرہ آب" کے عنوان سے یہ کہتے ہوئے فارسی کا جامہ پہنا دیا کہ :-

اگر گفتہ شد باز گویم بجاست

بات اگر اہم ہو تو ہزار پیرایوں میں دہرا دہرا کر کہنے سے وہ دل میں جگہ پاتی ہے یہ تو خاص قرآنی ڈکشن ہے :-

بانگ درا کی بیشتر ابتدائی شاعری کی مخاطب نئی نسل ہے۔ اقبال غلامی سے سخت متنفر اور آزادی کے متوالے تھے ہندوستان سے ان کو جو جذباتی لگاؤ تھا وہ ان کی نظموں میں بولتا دکھائی دیتا ہے۔ ہر بڑا فن کار غیر متعصب ہوتا ہے۔ کیونکہ

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

اقبال تو فرقہ بندی کے سخت خلاف تھے ان کی مشہور نظم "نیا شوالہ" کی فیصلہ کن بیت ہے :-

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اقبال نے ہندوستانی بچوں کا قومی گیت لکھ کر یہ بتادیا کہ مسلمانوں کے دلوں میں ہندوستان کی کتنی وقعت و اہمیت ہے۔ "میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے" جو ترانہ اقبال نے دیا وہ تو آج بھی قومی ترانہ شمار ہوتا ہے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

یہ ایک فطری تقاضہ ہے کہ آدمی کو اپنا گھر، اپنی گلی، اپنا شہر اور اپنا ملک بہر حال عزیز ہوتا ہے۔

اقبال نے رام، گرو نانک، گوتم بدھ اور دیگر اوتاروں کو خراج عقیدت پیش کر کے یہ ثابت کیا کہ نونہالوں کو ایک دوسرے کے مذہب اور احساسات کا ہر طرح کا خیال رکھنا سکھانا چاہیئے۔ اور ایک سیکولر ملک میں یہی کچھ تو ہونا چاہیئے۔ ہر شہر ہر ملک اور ہر شخص خالص انسانیت کی بنیاد پر ہی سر و شانہ بلند Head & shoulders above ہو سکتا ہے (اقبال کی مثال سامنے ہے)

یہی اقبال کا پیام تھا، یہی گاندھی اور نہرو کا خواب تھا۔ یہی میری آرزو ہے اور مجھے یقین ہے یہی آپ کا خیال بھی ہوگا۔

اقبال انصاری دہلی

ڈاکٹر امام اعظم —— ایک سلیقہ مند محقق

اپنی کتاب" منظر امام کی تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ" میں ڈاکٹر امام اعظم نے ایک بڑے پتے کی بات بڑی جرأت کے ساتھ کہی ہے۔" مُردہ پرستی کی روایت کو میرے ذہن نے قبول نہیں کیا۔ ادیب کی وفات کے بعد یا تو اُس کی شخصیت کے بہت سے پہلو فراموش ہو جاتے ہیں یا ان کی بابت ایسی سُنی سُنائی باتیں مشہور ہو جاتی ہیں جن کا ان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"

اس طرح ڈاکٹر امام اعظم اپنی اس کتب میں سب سے پہلے ایک روایت شکن کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس روایت شکنی کو انہوں نے بڑے سیدھے سادے الفاظ میں اور بڑے سلیقے سے..... RATIONALISE کیا ہے۔ فرماتے ہیں ——" زندہ شخصیت پر کام کرنے کا مثبت پہلو یہ ہے کہ متعلقہ شخصیت کے مخفی گوشوں تک رسائی حاصل کرنے میں وہ شخصیت بھی رہنمائی کرتی ہے۔ اور اس کے ہم عصر بھی اس میں معاونت کرتے ہیں۔ جہاں تک فن اور تخلیق کا تعلق ہے، اس کا رشتہ اپنے عہد سے جڑا ہوتا ہے۔ اور اس عہد کا آدمی ہی اس کی قدر و قیمت متعین کرتے ہوئے انصاف سے کام لے سکتا ہے۔"

محترم منظر امام صاحب ہمارے عہد کے نمائندہ شعرا میں سے ایک ہیں جو صرف زندہ ہی نہیں بلکہ بے حد زندہ بھی ہیں۔" بے حد زندہ" سے میری مُراد یہ ہے کہ ضعیفی کے عالم میں بھی ان کی فکر انتہائی توانا اور فن انتہائی جوان ہے —— چنانچہ مجھے ڈاکٹر امام اعظم کی" روایت شکنی" اچھی لگی ان کی یہ کتاب منظر امام صاحب کی شاعری پر ایک ایسا جامع تبصرہ ہے جو مجھ جیسے کم پڑھے لکھے شخص کے لئے بھی منظر امام صاحب کی شاعری کو آسان کر دیتا ہے۔ اِس" آسان کر دیتا ہے" سے میری مُراد یہ ہر گز نہیں ہے کہ منظر امام صاحب کی شاعری مشکل ہے۔ جہاں تک میں نے ان کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے، اُن کے زبان و بیان کی آسانی نے ہی ہر قدم پر اپنے رواں وجود کا احساس کرایا ہے —— چاہے ان کا پابند شعر ہو یا آزاد شعر —— ڈاکٹر امام اعظم نے اپنی تحقیق کے ذریعے منظر امام کی شاعری کے اُن گوشوں کو اُبھارا ہے جن سے منظر امام صاحب ہمارے سامنے صرف ایک

منفرد شاعر کی حیثیت سے ہی نہیں آتے بلکہ ایک عمدہ انسان، ایک سلجھی ہوئی سوچ کے دانشور، ایک باشعور فنکار اور ایک مثبت ناقد کی حیثیت سے بھی آتے ہیں۔

ڈاکٹر امام اعظم نے ایک اور حقیقت کا اظہار بھی بڑی سادگی کے ساتھ کیا ہے کہ "جہاں زندہ شخصیت پر تحقیقی کام کرنے میں بڑے فائدے ہیں، وہاں ایک بڑا نقصان بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ ادیب چونکہ زندہ ہے اور اس کا تخلیقی سفر جاری ہے۔ اس لئے اس کے تمام کا موں کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔" اور اس ضمن میں انہوں نے بڑی دیانت داری کے ساتھ اعتراف کیا ہے کہ وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وہ مظہر امام کے فنی اور ادبی ارتقاء کے سارے ابعاد سے انصاف کر سکتے ہیں

میں نے جب ڈاکٹر امام اعظم کی اس کتاب کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کیا تو مجھے موصوف کا مندرجہ بالا اعتراف حقیقت سے زیادہ کسر نفسی لگا۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے بڑی عرق ریزی کی ہے۔ اور بڑی کاوش سے مظہر امام صاحب کی شخصیت اور ادبی شعور کو قاری کے سامنے آئینہ کر دیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ انھوں نے مظہر امام پر بڑے سلیقے سے ریسرچ کی ہے۔ اور اپنی ریسرچ کے ماحصل کو بڑی تمیز سے قاری کے سامنے رکھا ہے۔ ادب کے طالب علم کی حیثیت سے وہ یہ بات جانتے ہیں کہ عام قاری ریسرچ نہیں کرتا۔ وہ تو کسی بات، کسی شخص، کسی موضوع کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہے، اس لئے کتاب اٹھالیتا ہے۔ اب اس کتاب میں موضوع کے بارے میں اطلاعات اگر ڈھنگ سے فراہم نہ کی گئی ہوں، یعنی کتاب اگر قاری کی توقعات پر پوری نہیں اتر رہی ہے تو قاری اسے بند کر کے ایک طرف ڈال دیتا ہے۔ چنانچہ اگر ادیب یہ چاہتا ہے کہ خشک موضوع پر اس کی تحریر کردہ کتاب کو قاری چند سطروں یا چند صفحات کے بعد مسترد نہ کر دے تو اسے اپنی بات سلاست اور سادگی سے ہی کہنی پڑے گی۔ اگر تحریر ابہام کی مسلسل نفی کر رہی ہے تو قاری اسے پڑھتا چلا جائے گا۔ ڈاکٹر امام اعظم کی یہ کتاب سلاست اور سادگی کی بہترین مثال ہے، اور ابہام سے کوسوں دور، اس لئے قاری کو آغاز سے ہی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے ——— یہی اس کتاب کی سب سے بڑی کامیابی بھی ہے اور سب سے بڑی خوبی بھی۔

اوپر میں نے ڈاکٹر امام اعظم کی ادبی سلیقہ مندی اور بیانی تمیز داری کا ذکر کیا ہے یہ دونوں وصف کتاب میں ابتدا سے انتہا تک جلوہ افروز ہیں اور ان اوصاف نے اس کتاب کی "کتابیت" کو بڑا حسین بنا دیا ہے۔ اس سلیقہ مندی اور تمیز داری سے کام لیتے ہوئے

مصنّف نے مظہر امام صاحب کا تفصیلی جائزہ اِس طرح لیا ہے کہ سب سے پہلے قاری کو مظہر امام صاحب کی حیات سے آگہی حاصل ہوتی ہے، اس کے بعد اُن کی شخصیت کے تمام گوشے ایک کے بعد ایک روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ پھر انہوں نے مظہر امام صاحب کا جائزہ پہلے ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے لیا ہے پھر نظم گو شاعر کی حیثیت سے ۔ مظہر امام صاحب کی شاعری چونکہ جدید حسیّت کی آئینہ دار اور عصری شعور کی مظہر ہے اِس لئے ان پہلوؤں پر مصنّف نے بڑی گہری نظر ڈالی ہے اور شاعر کے ساتھ پورا انصاف کیا ہے۔ جو وصف مظہر امام صاحب کو دوسرے تمام شاعروں سے الگ کر کے شعری دُنیا میں ایک منفرد مقام عطا کرتا ہے وہ ہے آزاد غزل کے میدان میں ان کی شوخی۔ اس میدان کے خالق بھی مظہر امام ہیں۔ اور اس میں آزاد غزل کی جو عمارت کھڑی ہوئی ہے اس کے معمار بھی مظہر امام ہیں۔ اس میدان میں اور اس میں تعمیر شدہ عمارت کا خاصّہ تفصیلی جائزہ ڈاکٹر امام اعظم نے لیا ہے۔ اور پھر بڑے سلیقے سے انکشاف کیا ہے کہ کیوں اور کس طرح اس عمارت کی تعمیر ہوئی۔ اسی طرح مصنّف نے شاعر کے فنکارانہ شعور کا بڑی باریکی اور بڑی گہرائی سے مطالعہ کر کے اپنی بات بڑی آسان زبان میں قاری کے سامنے رکھدی ہے اور کہا ہے کہ اس شعور نے ہی شاعر کو "شاعر نقّاد" اور "خاکہ نگار" کی حیثیتیں بھی عطا کی ہیں۔

مظہر امام صاحب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، بہت کچھ لکھا جائے گا۔ ادبی تنقیدی جائزے میں کوئی حرف حرفِ آخر نہیں ہوتا۔ نئی فکر کسی نہ کسی نئے پہلو کو اُجاگر کر دیتی ہے۔ مظہر امام کی شاعری پر بھی نئی فکریں نئے گوشوں کو اُجاگر کریں گی۔ لیکن ڈاکٹر امام اعظم نے جس طرح اُن کی شخصیت کی سادگی، ان کے شعور کی رفعت اور ان کے فن کی خوبصورتی کا احاطہ کیا ہے وہ ایک دستاویزی حیثیت کا حامل رہے گا۔ •••

شکور احمد چیئر کا قیام

مدرسہ تعلیم الاسلام بردا ہا ضلع مدھوبنی میں شکور احمد چیئر کا قیام عمل میں آیا ہے اہل قلم حضرات سے گذارش ہے کہ سرزمینِ متھلا سے تعلق رکھنے والے مجاہد آزادی، شعراء وادبار سے متعلق تحقیقی نگارشات سکریٹری مدرسہ ہذا کے نام ارسال فرمائیں۔ سلطان شمسی سکریٹری

اختر پیامی، کراچی

"دے دے رام دِلا دے رام
دینے والا سِیتا رام"

یہ آواز مسلسل آرہی تھی۔ صرف ایک کمزور سی دیوار ہی تو حائل تھی۔ اور شاعر بے خُودی کے عالم میں اپنی نظم سُنا رہا تھا۔ یہ نظم تھی امریکی ریشہ دوانیوں کے خلاف ایک بھرپور احتجاج۔ یہ وہ دَور تھا جب برصغیر میں آزادی کا سُورج طلوع ہو چکا تھا۔ اور غُلامی کی زنجیریں پگھل چکی تھیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ پُرانے شِکاری نیا جال لے کر جنوبی ایشیا کی طرف بڑھتے چلے آرہے تھے۔ ان کے قدموں کی چاپ صاف سُنائی دے رہی تھی۔ سِتم کی بات تو یہ تھی کہ آزادی کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں عنانِ حکومت تھی وہ بڑی خوش دِلی کے ساتھ گرفتاری پیش کر رہے تھے۔ اور پھُولے نہیں سماتے تھے۔ وہ "مارشل لا" کا نہیں "مارشل پلان" کا زمانہ تھا۔ آزاد مُلکوں کو معاشی زنجیروں میں جکڑنے کا زمانہ تھا۔ ہندوستان کے سیاسی رہنما ہاتھوں میں کشکول لئے الاپ رہے تھے...... "دے دے رام"

صُوبہ بہار کے دارالخلافہ پٹنہ میں بہار ریاستی اُردو کانفرنس کی تیاریاں زوروشور سے جاری تھیں۔ اس میں شرکت کے لئے مختلف اضلاع سے مندوبین آئے ہُوئے تھے۔ کچھ نوجوان ادیب و شاعر ہوٹل کے ایک کمرے میں جمع تھے۔ اور مناسب لائحہ عمل پر بحث ہو رہی تھی۔ اس کانفرنس میں ڈاکٹر عبدالعلیم اور پروفیسر اِحتشام حُسین بھی آنے والے تھے۔ اس وقت تک دوسرے صوبوں کی طرح بہار میں بھی ادیبوں کے دو دھڑے بَن چکے تھے۔ مسابقت شروع ہو چکی تھی۔ ترقی پسند ادیب چاہتے تھے کہ اُردو کی ریاستی تنظیم میں ان کی صحیح نمائندگی ہو۔ مگر ان کے مخالفین کی تعداد بھی کافی تھی۔ وہ لوگ اچھے عُہدوں پر تھے۔ اثر و رسوخ رکھتے تھے۔ اور پھر اربابِ حل و عقد تک بھی ان کی رسائی تھی۔ جب یہ باتیں ڈاکٹر علیم اور احتشام صاحب کو بتائی گئیں تو ڈاکٹر صاحب نے خفگی سے کہا "کسی سے التجا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ترقی پسند ادیب خود اپنا حق چھین لیں گے۔"

ان ہی مسائل پر گفتگو کرنے کے لئے کچھ لوگ ہوٹل کے کمرے میں اکٹھے ہُوئے تھے۔ مگر یہ آواز بار بار ان کا تعاقب کر رہی تھی...... "دے دے رام....."

تو یہ تھے نوشاد نُوری جو لہک لہک کر اپنی نظم سُنا رہے تھے۔

اُس وقت تک نوشاد سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مگر آواز بتا رہی تھی کہ وہ بہت جی دار شخصیت کا مالک ہے۔ حیرت یہ ہو رہی تھی کہ ایسی نظم لکھنے والا شاعر اور ایسی سوچ رکھنے والا احساس نوجوان ایسے لوگوں کا ساتھ کس طرح دے سکتا ہے جو منفی خیالات رکھتے ہیں اور ترقی پسندی کو لعنت سمجھتے ہیں۔

دوسرے دن نوشاد سے پہلی ملاقات ہوئی۔ چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے پوچھا۔ "کیا آپ نے 'یا خدا' پڑھی ہے؟" اس وقت قدرت اللہ شہاب کی اس کہانی کا ہندوستان میں بڑا چرچا تھا۔ شہاب صاحب نے اس کہانی میں بڑے ماہرانہ انداز میں مذہبی جبلّت کی طرف واضح اشارے کئے تھے۔ مَیں نے وہ کہانی نہیں پڑھی تھی۔ نفی میں میرا جواب سُنکر نوشاد نے مایوسی کا اظہار کیا۔ اور اس کے چہرے پر بیزاری کے اثرات صاف نمایاں تھے۔ اس نے کہا۔ "پھر تو آپ نے کچھ نہیں پڑھا۔" اس شخص کے بے ساختہ پن اور اندازِ بیان نے مجھے حیران کر دیا۔ یہ ساری علامتیں تو کسی اور بات کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ پھر وہ رجعت پسندوں کے حلقے میں کس طرح شریک ہو سکتا ہے۔

بہت دنوں تک نوشاد سے رابطہ قائم نہیں ہو سکا۔ وہ ملاقات جو بہار ریاستی اردو کانفرنس کے دوران ہوئی تھی۔ دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ اس کانفرنس کے موقع پر زیڈ۔ اے تمنائی بھی پاکستان سے اپنے آبائی وطن آئے ہوئے تھے۔ یہ وہی تمنائی صاحب تھے جنہوں نے چینی ادیبوں کو اردو میں روشناس کرایا تھا۔ اور بہت سارے بلند پایہ چینی افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو اردو میں منتقل کیا تھا۔ مَیں نے ان سے کہا تھا۔ "آپ ہندوستان واپس کیوں نہیں آجاتے؟" ان کا جواب تھا۔ "تم لوگ مجھے دو ہزار روپیے کی ملازمت دِلا دو مَیں آجاؤں گا۔"

وقت کتنا ظالم ہے اور تاریخ کتنی بے رحم ہے۔!

طویل بے خبری کے عرصے میں مجھ پر اور نوشاد پر کیا گزری اس کی خبر ہم دونوں کو نہ ہوئی۔ نوشاد سے دوبارہ ملاقات مشرقی پاکستان کے دارالخلافہ ڈھاکے میں ہوئی۔ وہ عجیب انتشار کا دور تھا۔ لوگ عام طور پر معاشی بدحالی کا شکار تھے۔ پھر جب حالات کچھ بہتر ہوئے اور زندگی کے بنیادی مسائل کچھ حل ہوتے ہوئے نظر آئے تو ان اقدار کی تلاش شروع ہوئی جو ہم لوگ کھو چکے تھے۔ شعر و ادب کی کرید ہونے لگی۔ ینگ رائٹرز ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ اس کی نشستیں باضابطہ ہونے لگیں۔ ان میں سردار بنکوی، احسن احمد اشک، حنیف فوق، ام عمارہ، بانو اختر شہود، عطاء الرحمٰن جمیل، کلیم اللہ مسعود کلیم، صلاح الدین محمد، احمد الیاس، انور فرہاد، ایاز عصمی اور دوسرے بہت سارے ادیب و شاعر شرکت کرنے لگے

کچھ دِنوں کے بعد انجمن ادب قائم کی گئی۔ اب ادیبوں کا حلقہ کافی وسیع ہو چکا تھا۔ نوشاد نوری ہر جلسے میں شریک ہوتے تھے۔ ان کی شاعری ایک نئی جہت پر آ چکی تھی۔ مَیں نے محسوس کیا کہ وہ دیوار جو نوشاد کی آواز اور ہماری ادبی جدوجہد کے درمیان پٹنہ میں حائل تھی، گر چکی تھی۔ اور یہ جواں سال شاعر اسی قبیلے کا سرگرم رُکن بن چکا تھا جسے حق و صداقت کی جنگ عزیز تھی۔ یہ نوشاد کا نیا مگر پائیدار رُوپ تھا۔ پھر وہ کسی رجعت پسند تحریک یا جماعت سے وابستہ نہیں ہوئے۔

ان ہی دِنوں کی بات ہے جب ینگ رائٹرز ایسوسی ایشن کے جلسے کی کارروائی جاری تھی ایک نوجوان شخص حیران و پریشان آیا۔ اور اُس نے اعلان کیا۔ "مَیں ہندوستان سے آیا ہُوں، اس وقت انڈر گراؤنڈ ہُوں۔ ہندوستان کی پُولیس مجھے تلاش کر رہی ہے۔ میرا نام تیغ الٰہ آبادی ہے۔" یہی شاعر بعد میں مُصطفیٰ زیدی کہلائے۔

نوشاد نوری کی اِنسان دوستی اور رواداری کی ایک اور جھلک اس دور میں نظر آئی جب مشرقی پاکستان میں آزادی کی تحریک عُروج پر تھی۔ نیشنل عوامی پارٹی کے ممتاز رہنما مولانا عبدالحمید خاں بھاشانی کے دستِ راست مسیح الرّحمٰن کے ایک عزیز محمد نُور کی نیو کالونی میں میرے ہمسایہ تھے۔ ان کی سیاسی وابستگی کے سبب جب ڈھاکے میں ان کا قیام مشکل ہو گیا تو وہ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ گاؤں چلے گئے اور کچھ دنوں کے لئے نوشاد نوری ان کے گھر میں قیام پذیر ہوئے۔ نوشاد ان سے اس قدر قریب تھے یہ مجھے اُس وقت معلوم ہُوا۔

ہم لوگ کچھ ہی دن پڑوسی رہے۔ مگر وہ بھی ہم لوگوں کے لئے یادگار دِن تھے۔ نوشاد کی محبت، شفقت اور زِندہ دلی ان کے بچّوں کے حِصّے میں بھی آئی ہے۔ اس پُر آشوب دَور میں بھی وہ لوگ ہمارے ساتھ رہے اور ہمارے دُکھ درد میں برابر کے شریک رہے۔

نوشاد سے ہماری آخری ملاقات ۱۹۹۸ء میں ڈھاکے میں ہُوئی۔ مَیں اپنے دوست اور بنگلہ دیش میں 'ڈان' اخبار کے نمائندے حسن سعید کے ہمراہ ان کے گھر گیا۔ وہ اپنے گھر کے سامنے اپنی دِلآویز مُسکراہٹ کے ساتھ موجود تھے۔ ہم لوگ ۲۶ سال بعد مِل رہے تھے۔ نوشاد میں کوئی تبدیلی نہیں ہُوئی تھی بات چیت کا انداز وہی تھا۔ کچھ دیر کے لئے ایسا محسوس ہُوا کہ وقت کی رفتار رُک گئی ہے۔ ان کے گھر میں ان کی بیوی، بچّوں کے ساتھ چائے پیتے ہُوئے اس اپنائیت کا اِحساس ہُوا جو اَب رفتہ رفتہ مفقود ہوتی جا رہی ہے۔

پھر نوشاد ڈھاکہ کلب میں مجھ سے ملنے آئے۔ رات کا وقت تھا۔ وہ دو تین گھنٹے ساتھ رہے اور پھر گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرتے رہے۔ کسی نے شعر سُننے یا سُنانے کی خواہش نہیں کی۔ ہم لوگ باتوں کے سحر میں گرفتار رہے۔

بڑی محبّت کے ساتھ نوشاد نے اپنا مجموعہ "رہ و رسمِ آشنائی" مجھے بھیجا ہے۔ خوشی ہوئی کہ اس نے مجھے یاد رکھا۔ یہ کتاب بھی اس کی اِنسان دوستی کا ایک واضح رُخ پیش کرتی ہے۔ علیم اللہ صدیقی نے اسے ترتیب دیا ہے۔ اور نوشاد نے اُسے بنگلہ دیش کے ممتاز بنگلہ شاعر اسد چودھری کے نام معنون کیا ہے۔

نوشاد کی شاعری بلند آہنگ نہیں ہے۔ اس میں دِھیما پن ہے۔ اور جمالیاتی حُسن ہے۔ اس کے اشعار میں طوفان کی گھن گرج نہیں، بہتے ہوئے چشمے کی روانی ہے۔

نوشاد جذبات اور محسوسات کا شاعر ہے۔ اسی لئے جب زمانہ دراز کے بعد کوئٹہ سے اسے خط ملتا ہے تو اس کے اِحساسات میں اُبال آجاتا ہے۔ وہ رومان اور انقلاب کے امتزاج سے اپنی شاعری کا پیمانہ بناتا ہے۔

گرچہ زندگی کے تانے بانے بکھر چکے ہیں، تاریخ بدل چکی ہے اور جغرافیائی حدیں تبدیل ہو چکی ہیں، نوشاد اپنے دوستوں، رفیقوں اور چاہنے والوں کو یاد رکھے ہوئے ہیں۔ افسوس ہے کہ بنگلہ دیش کے قیام کے بعد وہ کبھی پاکستان نہیں آئے۔

نوشاد: تم نے ٹھیک ہی تو کہا ہے مگر

اب بہت دُور ہے کاغان سے رانگا ماٹی

شہناز پروین، کراچی

اکیسویں صدی کا پہلا دھماکہ

"برسوں سے ایک طرح لیٹے لیٹے اب تو اُلجھن سی ہونے لگی ہے۔"

"پھر تم کروٹ بدل لو نا۔۔۔" "اچھا تو بڑی خوش گمانی ہے جناب کو، ذرا آپ ہی یہ مشق کر کے دکھا دیں۔" دُوسرے نے کروٹ بدلنے کی کوشش کی مگر ہڈیاں چٹخ کر رہ گئیں۔ وہ زور سے ہنس پڑا۔

"ہاں مَیں تو بھول ہی گیا تھا کہ ہم زمین کی گردش کے ساتھ ہی پہلو بدل سکتے ہیں۔"

"تم یہاں کب سے ہو؟" ایک نے دُوسرے سے سوال کیا۔

"بہت دنوں سے، میں یہاں تم سب سے بڑا ہوں، اس دُنیا کے اصُول اُوپر والی دُنیا سے بہت مختلف ہوتے ہیں، وہاں عمر دن کا تعیّن مدتِ حیات سے کیا جاتا ہے اور یہاں زندگی کے خاتمے کے بعد عُمر کا آغاز ہوتا ہے، ویسے تو مَیں تم سے کافی چھوٹا ہوں۔ مگر پہلے آنے کی بنا پر بہت سوں سے بڑا ہوں۔ دوستو! مَیں یہاں جس تزک و احتشام کے ساتھ آیا ہوں تم تو ایسی تجہیز و تکفین کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ ایک بحرِ بیکراں تھا جو مجھے یہاں لے کر آیا تھا۔ محلّہ، پڑوسی، رشتہ دار، دوست، احباب، جانے انجانے، بے شمار لوگ اور ان سب کی آنکھوں کے قیمتی موتی میری ذات کو معتبر بنا رہے تھے۔

"یہ کب کی بات ہے؟" غالباً سو سال یا شاید اس سے بھی کچھ پُرانی بات ہو، نئے آنے والوں پر تو مجھے بڑا ترس آتا ہے، کفن کے کپڑے میں بھی وہ بات نہیں ہوتی، بہت کم لوگ ساتھ ہوتے ہیں۔"

"بس دوست کیا بتاؤں۔" ایک نئے آنے والے نے بڑے دُکھ سے کہا: "مَیں دیر تک زمین پر کفن میں لپٹا ہُوا کاندھا دینے والوں کا اِنتظار کر رہا تھا کہ یکایک شور سا مچا، سب نے باری باری میری رُونمائی کا فریضہ انجام دیا۔ میری بیوی کو بہت سی عورتیں گھسیٹتی ہُوئی لائیں، بے چاری کچھ غم سے نِڈھال تھی، کچھ لوگوں کے سلوک نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔ مَیں اس کی عادت سے اچھی طرح واقف ہُوں۔ وہ مجمع میں آنا پسند نہیں کرتی تھی، مگر ہر آنے والی خاتون لپٹ لپٹ کر اُسے اِس طرح ہلاتی کہ وہ بلبلا کر زور زور سے رونے پر مجبُور ہو جاتی، میری موت کا اسے غم ضرور تھا مگر ہر آنے جانے والے کے سامنے اس کا اِظہار کرنا اس کی فطرت میں شامل نہیں تھا۔ جب خواتین نے دیکھا کہ

وہ بہت دیر سے خاموش ہے تو میرے کانوں میں مختلف آوازیں آنے لگیں۔

"بیچاری کو سکتہ لگ گیا ہے۔" اس کے بعد کچھ خواتین اسے میرے اور قریب لے آئیں اور دھاڑیں مار کر روتے ہوئے بولیں "آخری بار دیکھ لو' بی بی اب یہ جا رہے ہیں"۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان جملوں پر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو زور زور سے بین کے انداز میں کہنے لگیں۔

"ارے اب لوٹ کر نہیں آئیں گے، معافی مانگ لو' جب تک یہ یہاں ہیں سب سن رہے ہیں' کہو کہ میاں مجھے معاف کر دو' اگر انہوں نے معاف کر دیا تو جنتی کہلاؤ گی"۔ بے چاری نے عافیت اسی میں جانی کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے' جب وہ نڈھال ہو گئی تو غالباً خواتین کو یک گونہ سکون محسوس ہوا' اور انہوں نے مردوں کو آوازیں دیں۔" اب آپ لوگ انہیں لے جائیں" ان خواتین میں سے کچھ نے بے ہوش ہونے کی بھی کوشش کی اور یہ ثابت کرنا چاہا کہ بیوی سے زیادہ انہیں مجھ سے محبت ہے' یہ میری بہنیں تھیں' میں خواتین کے مجمع سے اٹھا لیا گیا۔ اور مسجد میں نماز جنازہ پڑھائی جانے لگی تو بہت سے لوگوں نے ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کئے' میں زمین پر لیٹا ان کی حرکات دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا، مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے سلیمانی ٹوپی پہن رکھی ہو' سب مجھے مردہ سمجھ رہے تھے مگر میں سب کو دیکھ رہا تھا۔ چند لوگوں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر لواحقین سے اپنی مجبوریاں بیان کرتے ہوئے قبرستان نہ جانے کی معذرت کی' بہت سے بغیر بتائے ہی کھسک گئے' بڑی مشکلوں سے میت گاڑی میں چار پانچ لوگ بیٹھے' یہاں تک لانے والے بھی چند قریبی عزیز واقارب ہی تھے"۔

"ہاں! اب تو ساری قدریں بدل گئی ہیں" ایک پرانے مردے نے نہایت تاسف سے کہا" یقین مانو میری موت کا سوگ سارے گاؤں نے منایا تھا"۔ "جی ہاں مجھے بھی یاد ہے اس وقت میں زندہ تھا' مجھے یہ بھی یاد ہے کہ چہلم پر بہت بڑی دعوت ہوئی تھی' آپ کی موت کے بعد ہم سب دعائیں کرتے تھے کہ اس خاندان کے دو چار اور گزر جائیں تو زندگی کے کچھ لمحے یادگار ہو جائیں گے' وہ مزے مزے کے کھانے تھے کہ اب بھی جی چاہتا ہے کہ پھر سے زندہ ہو کر ایسے سوئم اور چہلم میں شریک ہو سکوں"۔

"فضول باتیں نہ کرو' یہ بتاؤ میرے جنازے کے ساتھ کتنا بڑا مجمع تھا؟"

"سچی بات تو یہ ہے کہ اتنا بڑا اجتماع اب نظر نہیں آتا' لوگوں کے پاس اتنا وقت ہی

نہیں ہے، مجھے تو بڑی حیرت ہوئی کہ جو لوگ میرا دم بھرتے تھے اور جن پر مجھے بہت مان تھا وہ بھی دغا دے گئے، خیر اب ان کا ہم سے تعلق ہی کیا رہ گیا ہے۔"

"رونا تو بدلتی ہوئی قدروں کا ہے، کیا زمانہ آگیا ہے اب تو لوگ دکھاوے کے لئے بھی نہیں روتے، جنازے کے ساتھ بھی لوگوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے، شب برات، عید، اور بقرعید پر بھی بہت سی قبریں اگربتی اور پھولوں کے انتظار کے بعد غم سے مزید اندر دھنس جاتی ہیں پہلے تو شہر خموشاں میں بھی ایسے مواقع پر عید کا سا سماں ہوتا تھا...." ابھی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ دور کسی کونے سے ایک ضعیف آواز نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ "بھائیو! میں نے تمہاری داستانیں تو سن لیں مگر میرے ساتھ پیش آنے والے واقعے کو سن کر دہل جاؤ گے، اس کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز اور لہجہ کے کرب سے آس پاس کے مردوں کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔

میری دکھ بھری داستان سننے کو پتھر کا جگر چاہئے۔ میرا بے جان جسم سامنے دھرا تھا۔ اور چاروں بیٹے دست بگریباں تھے "پہلے جائیداد کا فیصلہ ہو جائے پھر میت اٹھائی جائے گی" لوگوں نے بہتیرا سمجھایا کہ پہلے اس فرض سے سبکدوش ہو جاؤ اس کے بعد فیصلے کر لینا مگر ان میں سے کوئی بھی اس پر آمادہ نہیں تھا، ایک بیٹی تھی جو بار بار بھائیوں سے التجا کرتی "بھائی مجھے اپنے لئے کچھ نہیں چاہئے" دو دنوں سے برف پگھل پگھل کر دوسرے کمروں تک آگئی ہے، سارے قالین پانی میں تیر رہے ہیں، خدا کے لیے اب انہیں اور تکلیف نہ دیں" بھائیوں نے پہلے بہن کو گھورا، ایک کی نظر اس قالین پر پڑی جو میں نے اسپین سے خاص طور پر خریدا تھا۔ اور اس کی اہمیت اور مالیت بھی بتائی تھی پھر دوسروں نے بھی دزدیدہ نظروں سے اس نادر قالین کی طرف دیکھا۔ میرے کانوں میں یہ آوازیں بھی آئیں "اس طرح تو بابا جان کو اٹھانا بھی مشکل ہو جائیگا، آپ لوگ تجہیز و تکفین کا انتظام کر ہی لیں۔" جی چاہتا تھا زمین پھٹ جائے اور اس میں سما جاؤں، محلے والوں نے لعنت ملامت کر کے عارضی طور پر جائیداد کے قضیئے کو ختم کرایا۔ وہ بھی دو دنوں سے بار بار آنے اور باری باری کھانا لاتے تھک چکے تھے۔ اس طرح میں میت گاڑی میں ڈالا گیا۔

میرے جسم کو جب قبر میں اتار رہا تھا تو میرے پانچویں بیٹے کے رونے اور بین کرنے کی آواز نے مجھے تڑپا دیا۔ کوئی تو ہے جو مجھ سے اتنی محبت کرتا ہے، وہ ملک سے باہر تھا غالباً چھٹی دیر سے ملی ہوگی، یا ٹکٹوں کے انتظام میں مشکل پیش آئی ہوگی، گھر جا کر حالات کا علم ہوا ہوگا

اور سیدھا یہاں پہنچا ہوگا' میری قبر پر اس کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔" بابا جانی مجھے بہت دیر ہوگئی آنے میں' اُنہوں نے مجھے بہت کم حصّہ دیا ہے" میرا جی چاہا کہ خود اپنی قبر پہ اتنی مٹی ڈال دُوں کہ اس کی آواز میری سماعتوں سے نہ ٹکرائے' سب نے کانوں کو ہاتھ لگایا' ایک لمحے کے لیے سکتے کا عالم طاری ہوگیا۔ یکایک ایک زور دار دھماکے کے ساتھ نہایت خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ ایک شخص زمین کی گہرائیوں میں اُترتا ہُوا ان کے قریب آگیا۔ پہلے تو وہ سب اسے حیرت سے دیکھتے رہے کیونکہ وہ جس تختے پر لیٹا ہُوا تھا اس کے کنارے بڑی صنّاعی کے ساتھ زمین کو قبر کے مخصوص انداز میں تراشتے ہُوئے مناسب جگہ پر آکر فکس ہوگئے تھے۔ ان سب کے چہرے سوالیہ نشان بنے ہُوئے تھے۔" بھائی تم کون ہو اور ہماری بستی میں اِسطرح کیوں نازل ہُوئے ہو؟"

"جی مَیں آپ ہی کی برادری میں شامِل ہونے آیا ہُوں' مَیں خود کار مشینوں کے ذریعے کفن میں لپٹا اور ایسی ہی خود کار مشین براہ راست زمین سے مِٹی ہٹاتی اور اسے قبر کے انداز میں تراشتی ہُوئی میرے جسم کو اس میں داخِل کر کے اپنی جگہ لوٹ گئی ہے۔ بات یہ ہے کہ بچپن سے مَیں نے اپنے بزرگوں کو شکوہ کرتے سُنا تھا کہ اب لوگوں کی مصروفیات اِتنی بڑھ گئی ہیں کہ عام دنوں میں مرنے والوں کو کاندھا دینے والے بھی نہیں ملتے۔" ویک اینڈ (WEEK END) پر بھی اوّل تو وہ چھٹی انجوائے نہیں کر سکتے اور بے آرام ہوتے ہیں' پھر گھر کے کام کاج کا ایک ہی تو دِن ہوتا ہے وہ بھی ایسے کاموں کی نذر ہو جاتا ہے' اِس لئے مَیں نے بہت دنوں سے ایک پروجیکٹ پر کام شروع کر دیا تھا' اللہ کا شکر ہے کہ میرا تجربہ کامیاب رہا' اب مَیں نہایت سکون سے آیا ہُوں اور دُوسروں کے لئے بھی اطمینان ہے کہ میری ایجاد کی وجہ سے کوئی بے گور و کفن نہیں ہوگا۔ جس طرح کِسی کارخانے میں چیزیں ایک خانے سے دُوسرے خانے میں آٹو میٹک طور پر منتقل ہوتی ہیں' پھر آخری مرحلے کے بعد ریموٹ کنٹرول سے بٹن دبا کر نتیجہ سامنے آتا ہے بالکل اسی طریقے پر مرنے والے کو اگر میری بنائی ہوئی مشین میں ڈال دِیا جائے تو پہلے مرحلے سے آخری مرحلے خود بخود طے ہو جائیں گے' مرنے والا آخری سانس لینے سے پہلے یہ بٹن خود بھی دبا سکتا ہے' دُوسری صُورت میں بھی گھر والوں کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی' بس ایک بٹن دبانے کی دیر ہوگی اور مُردہ خود ٹھکانے لگ جائے گا۔ مَیں نے تو خُود ہی اپنے ہاتھوں سے ریموٹ استعمال کیا تھا ظاہر ہے رات کے بارہ بجے مَیں دُوسروں کو کیوں پریشان کرتا' یکایک سب کی نظریں اس کے ہاتھ پر لگی ہوئی گھڑی پر پڑیں جہاں تاریخ کی جگہ ۳۱ دسمبر ۲ء پر وقت ٹھیک بارہ بجے آکر تھم گیا تھا۔

●●●

نسیم محمد جان، دربھنگہ

افسانچہ

زبان

"آنکھیں بند کرو"

"کیوں؟"

"بند تو کرو"

"آخر کیوں؟"

"بہت اچھی چیز لایا ہوں تمہارے لئے"

"آپ کے جیسا کنجوس شوہر بھلا کیا لائے گا۔ میری ایسی قسمت کہاں؟"

"______"

"اچھا لیجئے، کہتے ہیں تو بند کر لیتی ہوں"

"اب کھول دو"

"ارے ونڈرفل ______ یہ شال تو بہت خوبصورت ہے ______ آج سورج مغرب سے نکل آیا ______ پہلی بار آپ ایک ایسی چیز لائے ہیں جو مجھے پسند آئی"

"اب تو خوش ہو"

"بہت خوش ______ آج آپ جو مانگیں گے دوں گی"

"وعدہ"

"وعدہ"

"تم اپنی زبان مجھے دے دو"

افسانچے

ڈاکٹر مظفر مہدی، دربھنگا

ٹوپی: اخبار میں چھپی تصویر پر دو نوجوان تبصرہ کر رہے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا:
"یار! ٹوپی میں یہ شخص خوب جچتا ہے اور اس کی شخصیت میں چار چاند لگ جاتا ہے۔"
دوسرے نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا: "ہاں تم ٹھیک کہتے ہو لیکن کیا تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ یہ شخص ٹوپی پہن کر 'اپنا' نہیں معلوم ہوتا ہے۔"

پردے کی عورت: "پردے پر دوسروں کے لئے مسکراہٹ بکھیرنے والی عورت جب گھر لوٹ کر آتی ہے تو وہ خالی خالی ہوتی ہے اور اسکی مسکراہٹ غائب ہوتی ہے۔ اس کا شوہر جب اس سے دریافت کرتا ہے کہ تمہیں کیا ہوا ہے اور تمہاری مسکراہٹ کہاں چلی گئی ہے؟ تو وہ کہتی ہے کہ میں اپنی مسکراہٹ کو پردے پر ہی چھوڑ آئی ہوں۔"

کرشمہ: وہ آزادی کی شب پیدا ہوا تھا اور اس کے کانوں نے اذان کی جگہ آزادی کے کلمے سُنے تھے اس کے بعد سے وہ مستقل یہ سنتا رہا کہ ہم آزاد ہیں اور آزاد ملک کے شہری ہیں۔ وہ ایک آزاد ماحول و فضا میں پل بڑھ کر جوان ہوا تھا اور آج بھی وہ آزاد تھا۔ ہر طرح سے آزاد۔

پھولوں کا ہار: وہ نوجوان تھا سنجیدہ تھا، خوش فکر اور ذہین تھا۔ اس کی متانت اور صلاحیت کی قدر اس کے ساتھی اور اس کے بزرگ بھی کیا کرتے تھے۔ لیکن جب ایک محفل میں اس کے دوستوں اور بزرگوں نے مل جل کر اس کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالا تو اس کے جسم میں ایک برقی لہر دوڑ گئی اور بڑی سُرعت کے ساتھ اس کا قد لمبا ہونے لگا اور اس قدر لمبا ہوا کہ سارے لوگ اُسے بونے نظر آنے لگے۔

مامتا: "بازار میں جوں جوں دودھ کے ڈبے آتے گئے ماؤں کی چھاتیاں خشک ہوتی چلی گئیں۔ اور ان کے چہروں میں لالی آگئی۔ لیکن بچوں کے چہرے زرد پڑنے لگے۔"

ڈاکٹر علقمہ سلفیؔ دربھنگا

نرگس

(منی کہانی)

نرگس بہت حسین تھی۔ اُس کی غزالی آنکھوں پر لمبی پلکیں جھلملاتی رہتی۔ کتابی چہرہ بڑا دلکش تھا وہ بات بات میں مُسکرانے لگتی۔ اخلاق و کردار اعلیٰ اور سیرت کی مثال محلہ کی عورتیں اپنی بچیوں کو دیا کرتیں۔ اُس نے دینی کتابوں کے علاوہ اِسکول کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ وہ والدین کی آنکھوں کا تارا تھی۔

نرگس نے جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو سلمہ کہا کرتی مِری لاڈلی کا کیا ہوگا؛ جھونپڑی میں خدانے چاند کو کیوں پیدا کر دیا۔ اس کی ناز بر داری کون کرے گا؟

سلیم اپنی بیوی کو سمجھاتے خدا کی ذات پر بھروسہ رکھو۔ میرے پاس تو جہیز کے نام پر کچھ نہیں ہے۔ پیٹ کاٹ کر کچھ زیور بنوالیا ہے۔ لیکن اُس سے کیا ہوتا ہے۔ غریب کی جھونپڑی کی طرف کوئی دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔ فکر کی بات تو ہے لیکن نا اُمیدی کفر ہے۔

نرگس کی خالہ کی شادی تھی۔ وہ اپنی نانیہال گئی تو ڈاکٹر اقبال صاحب کی اہلیہ بھی مدعو تھیں۔ اُنہوں نے نرگس کی صورت اور سیرت کو دیکھا تو وہ گرویدہ ہوگئیں۔ ڈاکٹر صاحب سے سرفراز کی شادی کے لئے مشورہ کیا اُن کو اپنے ڈاکٹر بیٹے کے لئے ویسی ہی بہو چاہئے تھی۔

وہ سلیم صاحب سے ملے تو اُنہوں نے صاف لفظوں میں جواب دے دیا: میرے پاس نرگس بٹیا کے علاوہ دینے کو کچھ نہیں، مخمل میں ٹاٹ کا پیوند اچھا نہیں لگتا۔

"مَیں غریب ہوں۔ ہاں بھائی مجھ کو نرگس دیدیجئے۔ مَیں آپ کے قدموں پر سر رکھدوں گا۔" ..... ڈاکٹر صاحب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟

"مَیں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔" ..... اور پھر بڑی سادگی سے نرگس کا نکاح ہوا اور وہ خوشبوں کی ڈولی میں اپنے پیا کے ساتھ چلی گئی۔ اُس موقعہ پر نرگس کے ہزاروں پھول کھل اُٹھے!

پروفیسر اویس احمد دوراںؔ، دربھنگہ

غزل

ادب سے اپنی آنکھیں مُوند کر سب کی سُنی تو نے
کسی محفل میں بھی اے دل زبردستی نہ کی تُو نے

غریبوں کے لیۓ دَوراںؔ جوانی کاٹ دی تو نے
ضعیفی آگئی تو کی خُدا کی بندگی تو نے

متاعِ آگہی اے دل وَدیعت کی گئی تجھ کو
خود اپنے گھر کے بچّوں میں بھی وہ تقسیم کی تو نے

مرا بے چین پہلو رات بھر سونے نہیں دیتا
مُجھے بے خواب کر ڈالا ہے چشمِ نرگسی تو نے

مرے معصوم بچپن کی اری او تیز چنگاری
بھڑک کر سارے ارمانوں کی نگری پھونک دی تو نے

فضائے عارض و گیسو بھی غمگیں ہو گئی ہر سُو
دوانے! اس قدر پُر سوز دھن کیوں چھیڑ دی تو نے

کسی بھوکی ضعیفہ یا کسی زخمی پرندہ کی
ارے بے رحم ابھی دیکھی نہیں بے چارگی تُو نے

مَیں رویا گڑگڑایا پھر بھی تیرا دِل نہیں پگھلا
ہمیشہ کی نظر انداز میری مفلسی تُو نے

کسی البیلے پیکر سے کہ حُورانِ بہشتی سے
بتا اے یار سیکھی کس سے گُل پیراہنی تُو نے

مرے شاعر! تجھے یاد آئے بچپن کے سہانے دن
پپیہے اور کوئل کی صدا جب بھی سُنی تو نے

یہ دِل آزار خبریں گشت کرتی پھر رہی ہیں کیوں؟
بتا دوراں غریبوں کی سیاست چھوڑ دی تو نے؟

ڈاکٹر عبرتؔ بہرائچی، یو۔پی

غزل

ہے برقرار زمیں آسمان باقی ہے
ہمارا اب بھی کوئی امتحان باقی ہے

ابھی تو اور ستم ہم پہ ڈھائے گی دُنیا
یہ دیکھنے کے لئے آسمان باقی ہے

ہمارے بچّوں کو رہبر اب نہیں حاجت
ہمارے پاؤں کا اِک اِک نشان باقی ہے

اساس رکھی تھی جس کی لہو پہ ہم نے کبھی
ہمارے گاؤں کا بس وہ مکان باقی ہے

ضرور ہو گئے محروم تخت و تاج سے ہم
جو شان پہلے تھی اب بھی وہ شان باقی ہے

ابھی تو دِل ہی دیا ہے جناب کو مَیں نے
ابھی تو کرنے کو کچھ اور دان باقی ہے

سکون و امن کی باتیں زباں پہ مت لانا
اِک اور جنگ کے لئے تائیوان باقی ہے

مِٹانے والوں نے کیں کوششیں بہت لیکن
خُدا کا شکر کہ اُردو زبان باقی ہے

یہ کیسے چھوڑ دیا قاتلوں کو مُنصف نے
ابھی تو دینے کو میرا بیان باقی ہے

ہمارے میل و محبت سے آجتک عبرتؔ
ہمارے شہر کا امن و امان باقی ہے

پروفیسر ایم۔ کمال الدین، دربھنگا

غزل

لاؤ پانی کہ اب وضو کر لیں
اپنے آقا کی جستجو کر لیں

زخم دامن پسارے بیٹھے ہیں
برگ گل سے اسے رفو کر لیں

کوئی بھی بات اب نہیں کہنی
پھر بھی چاہو تو گفتگو کر لیں

موقعۂ واردات خالی تھا
جرم اپنا ہی رو برو کر لیں

لمحے زخمی بنے سسکتے ہیں
اس کی بالیں پہ ہاؤ ہو کر لیں

"جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود"
تو تجھی ہی سے ما و تو کر لیں

قتل سے پہلے ان سے کہہ دیجئے
سارا منظر لہو لہو کر لیں

اب کی چیخیں گے چاہے جو بھی ہو
کھڑکیاں بند کو بہ کو کر لیں

جانے کھل جائے کب زباں اپنی
تیری تعریف رو برو کر لیں

غزلیں

مجاز نوری، دربھنگا

خوشبو ملے جمال ملے یا ادا ملے
رنگت میں لالہ آپ کے عارض سے کیا ملے

خنجر کی دھار، سوزِ جگر، زخمِ دل، لہو
اس کائنات درد سے اب اور کیا ملے

مدت سے اک حصارِ تمنا میں قید ہیں
ہم بھی نکل چلیں جو کوئی راستہ ملے

کب یہ کہا کسی سے دعا کو ملے اثر
ہاں یہ کہا ضرور کہ لب کو دعا ملے

نوری شبِ وصال انہیں نیند آگئی
مدت پہ وہ جو آن ملے بھی تو کیا ملے

غلام فرید، علی نگری

تڑپ رہا تھا اک بھوکا جو سائباں کے تلے
پڑا ہے اس کا جنازہ یہ آسماں کے تلے

چمک رہی ہے عمارت جو شان و شوکت کی
دبا ہے آہ غریبوں کی اس مکاں کے تلے

نگاہِ نیک سے سینچا تھا دل کے پودے کو
وہ پھول پھل نہ سکا ابرِ بدگماں کے تلے

نہیں پسند تھا تم کو تو کوئی بات نہ تھی
نہ ہوتا دفن میں اس سنگِ آستاں کے تلے

عجیب بھیڑ قیامت کی ہے وہاں لوگو!
فرید کشتی میں تنہا ہے بادباں کے تلے

پروفیسر نازؔ قادری، مظفر پور

غزل

خلا سے تیر جو برسے تو سرخیاں جاگیں
لہولہان پرندوں کی ٹولیاں جاگیں
گرے ہیں ٹوٹ کے برج فلک سے کچھ تارے
نشیب ارض کی تاریک وادیاں جاگیں
سبک تھپیڑوں سے مانجھی بھی ہو گئے ہوشیار
جماہی آئی سمندر کو کشتیاں جاگیں
دکھائی دیتے ہیں گلیوں میں رینگتے سائے
خبر نہیں کہ کب سوتی بستیاں جاگیں
عجب سہاگ رچاتا ہے موسم گل بھی
اجاڑ پیڑ کی شاخوں میں پتیاں جاگیں
ہمارے شہر میں ہیں اور بھی تو ہم جیسے
ہماری سمت ہی کیوں سب کی انگلیاں جاگیں

ظفر اقبال ظفرؔ، فتح پور (یو۔ پی)

غزل

بدن کی ریت دریا مانگتی ہے
سروں کی دھوپ سایا مانگتی ہے
کنایہ ہی کنایہ اس کی آنکھیں
غزل بھی استعارہ مانگتی ہے
مرے لہجے میں خوشبو ہے کسی کی
سند لیکن حوالہ مانگتی ہے
مجھے ہوتی ہے سناٹوں سے وحشت
مری وحشت تماشہ مانگتی ہے
یہ کیسی اجنبی آہٹ ہے ہر سو
نظر چہرہ شناسا مانگتی ہے
مری سانسوں میں ویرانی کے موسم
زمین دشت سبزہ مانگتی ہے

علاء الدین حیدر وارثی، دربھنگا

غزل

اس طرح سے تری یادوں نے ستایا کیوں ہے؟
میری تنہائی بنی میرا مقدر تو فرد ر
مَیں تو تاریک گذر گاہوں سے گذرا تھا ابھی
مَیں تو زندہ ہوں فقط تیرے لیے ہی اب تک
سانس بن کر تو مری جاں میں سمایا کیوں ہے؟
لمحہ لمحہ تو میرے ساتھ ہی رہتا کیوں ہے
پُر خطر راہ میں لیکن یہ اجالا کیوں ہے
بن کے راحت مری ہستی کو مٹایا کیوں ہے
مَیں نے مانگا تھا فقط لمحۂ قربت حیدر
سوز بن کر مری چاہت کو جلایا کیوں ہے

غزلیں

ناشاد اورنگ آبادی
سمستی پور

دیدے جو حق پہ جاں وہ دِوانہ پسند ہے
چُوکے نہیں کبھی وہ نِشانہ پسند ہے

گذرے ہُوئے زمانوں میں کیا کچھ نہیں ہُوئے
جیسا بھی ہے مجھے یہ زمانہ پسند ہے

بارش کے پانیوں میں نہانے کے واسطے
گھر سے نکل کے لان میں جانا پسند ہے

اب تک نہ آپ آسکے وعدوں کے باوجود
لکھا ہے آج پھر جو بہانہ پسند ہے

دولت کے اندھے لوگوں کو دولت کے واسطے
بیٹھا ہو سانپ بھی تو خزانہ پسند ہے

شاہدہ نسیم سالک، ویسٹ چیسٹر، امریکہ

وہ اجنبی تھا، اس سے کوئی رابطہ نہ تھا
چاہت وہ دوستوں میں کبھی بانٹتا نہ تھا

تم کیا گئے کہ لے گئے آنکھوں سے سارے خواب
ورنہ ہمارے بگڑے مقدر میں کیا نہ تھا

کیوں ہم نے دِل مسیحا کے پہلو میں رکھ دیا
عقدہ ابھی تو چارہ گری کا کھلا نہ تھا

شیریں بہت تھا اس کا ہر اندازِ گفتگو
کیا حرف تھا جو اس کے لبوں پر سجا نہ تھا

جانا تو چاہتا تھا یہ دِل اس کی بزم میں
لیکن وہ دوست بھی تو کرم آشنا نہ تھا

پروفیسر افتخار اجمل شاہین، کراچی

شاد ہم کو جو خوبرد کرتے
ہم بھی جینے کی آرزو کرتے

اس کے کہنے میں آگئے کیوں تم
بات ہم سے تو روبرو کرتے

خود نمائی تمہاری مٹ جاتی
آئینے میں اگر جو "ھو" کرتے

ہم پہ ہی فرض جانثاری تھی
ہم نہ کرتے تو کیا عدو کرتے

کھو گیا جب سے وہ متاعِ جاں
قریہ قریہ ہیں جستجو کرتے

کوئی کارِ ہنر جو کر جاتے
ذکر اپنا بھی کوبکو کرتے

کشتۂ آرزو ہیں ہم شاہین
لوگ کیسے ہیں آرزو کرتے

رفیعُ الدّین رازؔ، کراچی

غزل

زندگی خود ہی حلیفِ رہِ غم ہوتی ہے
بوجھ بڑھتا ہے تو رفتار بھی کم ہوتی ہے

اوس کی بوند سے خوابوں کو لکھا کرتے ہیں
دھوپ کی شکل میں تعبیر رقم ہوتی ہے

اِنکسار آشنا ہوتا ہے انا کا پیکر
پیڑ خم ہو کہ نہ ہو شاخ تو خم ہوتی ہے

اِک کسک چٹکیاں لیتی ہے ازل سے دِل میں
اک خلش ہے کہ جو بڑھتی ہے نہ کم ہوتی ہے

پھول شبنم کی رفاقت ہی سے پاتا ہے جِلا
آنکھ نم ہو کے ہی شائستۂ غم ہوتی ہے

عمر بھر خاک اُڑاتی ہے سروں پر سب کے
یوں تو کہنے کو زمیں زیرِ قدم ہوتی ہے

پروفیسر ام۔ اے ضیاءؔ، گیا

غزل

پاگلوں کے شہر میں تنہا ہوں میں
اِس لئے شاید یہاں رُسوا ہوں میں

اِک جزیرہ تشنگی کا آپ ہیں
پاس میرے آئیے دریا ہوں میں

حق بیانی کی سزا دار و رسن
چُپ بھی رہ کر زہر ہی پیتا ہوں میں

آپ کی ہمدردیاں ہیں کس لئے
آپ کا کوئی نہیں لگتا ہوں میں

ہاتھ میں پتّھر لئے ہیں سب ضیاءؔ
اُن کی نظروں میں کوئی شیشہ ہوں میں

مختار احمد عاصی، مظفر پور

غزل

یہ دُنیا کی کہانی بولتی ہے
سدا اک کِس کی چاندی بولتی ہے

کہیں دہشت، کہیں وحشت ہے رقصاں
وطن کی بستی بستی بولتی ہے

کرو ہرگز نہ اب خونی سیاست
وطن کی پاک مٹّی بولتی ہے

غُلامی سے رہائی پا چکے ہیں
مگر پھر بھی غریبی بولتی ہے

زباں جب سے سیاسی ہو گئی ہے
یہ مطلب کی سلامی بولتی ہے

عذابِ زندگی ہے وہ امیری
تکبّر کی جو بولی بولتی ہے

سمجھ نادان موسم کا تقاضہ
ہوائے انقلابی بولتی ہے

فریبِ نُور ہے جشنِ چراغاں
اُجالوں سے سیاہی بولتی ہے

مُسلسل جہد سے مِلتی ہے منزل
بشر سے ہنس کے چیونٹی بولتی ہے

محبّت ایک خوشبو کی طرح ہے
گلابوں سے یہ جُوہی بولتی ہے

بہت ہے قیمتی ایمان والا
یہ قُدرت کی کسوٹی بولتی ہے

وہ کرتی ہے دِلوں کی ترجمانی
غزل عاصی کی جب بھی بولتی ہے

سُلطان شمسی، دربھنگا

غزل

نہ جانے کون سی منزل مجھے بتا کے چلے
وہ ہر قدم پہ نیا راستہ بتا کے چلے

ہماری بندگی مقبول بھی ہوئی کہ نہیں
جبینِ شوق ترے در پہ ہم جھکا کے چلے

یہ ظلم دیکھیے گلچیں کا جو یہ کہتا ہے
چمن میں باغباں اپنی نظر جھکا کے چلے

وہ اپنی منزلِ مقصود کو پہنچ ہی گئے
جو راہرو کی طرح ساتھ رہنما کے چلے

یہ کِس کے سایۂ گیسو کی آرزو تھی ہمیں
جو غم کی دُھوپ میں ہم جسم و جاں جلا کے چلے

پڑا ہوا ہوں سرِ راہ مثلِ گردِ سفر
مجھے بھی کاش کوئی ہم سفر بنا کے چلے

اٹل بہاری باجپائی، وزیر اعظم ہند

مَیں سوچنے لگتا ہُوں

تیز رفتار سے دَوڑتی بسیں
بسوں کے پیچھے بھاگتے لوگ
بچّے سَنبھالتی عورتیں
سڑکوں پر اتنی دُھول اُڑتی ہے
کہ مُجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا
مَیں سوچنے لگتا ہوں

بُزرگ سوچنے کے لئے آنکھیں بند کرتے تھے
مَیں آنکھیں بند ہونے پر سوچتا ہوں
بسیں ٹھکانوں پر کیوں نہیں ٹھہرتیں؟
لوگ لائنوں میں کیوں نہیں لگتے
آخر یہ بھاگ دوڑ کب تک چلے گی

دیش کی راجدھانی میں
سَنسد کے سامنے
دُھول کب تک اُڑے گی
میری آنکھیں بند ہیں
مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا
مَیں سوچنے لگتا ہُوں!

ڈاکٹر فہیم اعظمی، کراچی

گیان ہی گیان

بیری کا بھوت
حتی الامکان
پنگھٹ کی دیوی
دردو پدی سمان
مَسجد کا جن
منظہرُ الایمان
مَندر کی گوپی
ہے بھگوان
کعبہ کا پتھّر
رشکِ آسمان
پھَل پھُول دَھان پان
سمندر، جنگل، ریگستان
ٹڈی مچھلی تیر کمان
مکان۔ قبرستان۔ سقراط۔ شری مان
اندر باہر کا شیطان
بیچارہ اِنسان!

حسن امام درد، دربھنگا

دستور

فضا میں کثافت تھی گہرا دھواں تھا
مگر اک کرن
چیر کر اس کثافت کو اُبھری
یہ اُمید کی اِک کرن تھی
جسے سیکڑوں سال سے آج تک ہم
جھروکے میں دِل کے سجائے ہُوئے ہیں
اُسے پُوجتے تھے
اُسے پوجتے ہیں
مگر گیان اُس کا ابھی بھی نہیں ہے
نہ اُس سے کوئی لابھ ہم کو ہُوا ہے
نہ اس پر بھروسہ رہا ہے ہمارا
کسی کو شکایت ہے بے چارگی کی
ہیں نادار اسی کی شکایت کسی کو
مسرت کی سنگینیوں کی شِکایت
غم و رنج ہے ہی شِکایت کے لائق
تو اچھا ہے کچھ سال ایسے ہی گذریں
کہ صدیوں سے جو زنگ اپنے ذہن پر
لگا ہے وہ چھُٹ لے
اسی واسطے ہم بھی یہ سوچتے ہیں
کرن جو سنگھاسن سے لپٹی ہوئی ہے
اُسے پھر جھروکے میں دِل کے سجا لیں
خیالوں کی رنگینیوں، فلسفوں میں
حقائق کی تلخی سے نظریں چُرا لیں!

محمّد سالم، نیو جرسی، امریکہ

ہم گر گئے تاریک کنوئیں میں

خُدا کی رسّی کو تھامے رہے
ہم زندگی میں جب تلک
تارے یقیں کے
جگمگاتے ہی رہے اندر
دلوں کے آسمانوں میں
یہ دُنیا یُوں
ذلیل و خوار، بے قیمت ہُوئی
قدموں تلے اپنے
مگر اِک چوک سی ہم سے ہوئی
غفلت کے کارن یہ
کہ ہم نے چھوڑ دی ڈوری
نصیحت اور حکمت کی
تو پھر
ہم گِر گئے تاریک کنوئیں میں!

علقمہ شبلی، کلکتہ

بارشِ سنگ

دشتِ دل میں آج کون
فیلِ بے زنجیر کی مانند پھر
سر اُٹھائے، بے دھڑک
آرہے ہیں تیز تیز
اپنی سونڈوں میں لئے زہرابِ مکر و دشمنی
تاکہ ڈھائیں کعبۂ دل
ذائقہ مجھکو چکھائیں موت کا

ہے تمنّا آج زخمی
آرزو کے لب پہ ہے مہرِ سکوت
اے ابابیلو! کہاں ہو آج تم؟
آؤ، آکر سنگریزوں کی کرو بارش کہ پھر
صورتِ خاشاک و خس
پارہ پارہ جس سے ہو جائیں یہ فیل!

ڈاکٹر حنیف ترین، سعودی عربیہ

خوشبو کو ملہاریں گائیں

جلتے دیپک کی لہر کی باتی
جب مجھ میں پر پھیلاتی ہے
وقت کی اُونچائی کو چھُو کر
امبر سے نیچے آتی ہے
لمبی تان کے سو جاتی ہے
بستر میں جنّت کا کونا
پینگ بڑھاتا جسم کا سونا
کروٹ میں جب خم لیتا ہے
نشے کو جھوٹا کر دیتا ہے
ایسے میں آؤ رنگ جمائیں
عیش و طرب کے ساز بجائیں
صُبح و مسا کو بھی گرمائیں
خوشبو سی ملہاریں گائیں۔!

پروفیسر جابر حسین، پٹنہ

ہم میں وہ تاثیر کہاں

رات کی تاریکی میں
مَیں نے
خاموشی سے جلنے والی
آگ سے پُوچھا
کیسی ہو
کیسے ہیں، حالات تمہارے

سہمی سہمی، لرزاں لرزاں
اندیشوں کی
آگ میں ڈوبی
بولی
کیا پوچھو ہو، ہم سے
ہم میں وہ تاثیر کہاں، جو
لفظوں میں، تقریروں میں ہے
ہم تو جلتے ہیں
(جب بھی جلتے ہیں)
خود کو راکھ بناتے ہیں

لیکن لفظوں، تقریروں کی آگ
جلاتی ہے اَوروں کو
لمحہ لمحہ اِنسانوں کے
خون بہاتی رہتی ہے
اِنسانوں کو
خاک بناتی رہتی ہے
لفظوں، تقریروں کی آگ
ہمیشہ
ایوانوں کی زینت بن کر
اپنی جان بچاتی ہے

ایک زمانہ تھا، جب
ہم بھی
شعلوں سے
کھیلا کرتے تھے
انگاروں کی سیج پہ
نازک پھولوں کے
پیکر سجتے تھے

اب لیکن وہ پھول کہاں ہیں
انگاروں کی سیج کہاں ہے
اب تو لفظوں، تقریروں
کی آگ سے
ایوانوں کے گنبد
روشن ہیں

کیا پوچھو ہو، ہم سے
ہم تو خود ہی
لفظوں، تقریروں کی آگ میں
ایسے جھلس گئے ہیں
جیسے ہم پر
کسی خدا کا
قہر پڑا ہو

کیا پوچھو ہو، ہم سے
ہم میں وہ تاثیر کہاں!

ڈاکٹر منصور عمرؔ، دربھنگا

تمثیلِ نو

صنعتِ توشیح

ت ــــ تعلّق کے شجر سُوکھے پڑے ہیں — سلگتی دُھوپ میں ہم تپ رہے ہیں

م ــــ محبّت کے گلے میں طوقِ لعنت — مگر دستِ ہوس پھیلے ہُوئے ہیں

ث ــــ ثنا خوانی کریں گے ہم بھی ان کی — جو عرش و فرش پر چھائے ہوئے ہیں

ی ــــ یہی تو ہے طلسمِ خوابِ خوباں — مرے قدموں میں تارے آگرے ہیں

ل ــــ لہُو کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے — مگر تمثیلِ نو کے لخلخے ہیں

ن ــــ نئی دُنیا بسانے کی تمنّا — نئے انداز سے ہم سوچتے ہیں

و ــــ وہ سارے لوگ نکلے دُشمنِ جاں — جو مجھ سے دوستی کرتے رہے ہیں

ڈاکٹر منصور عمر

قہرِ الٰہی

(گجرات کے زلزلہ سے متاثر ہو کر)

خدا بے وجہ قہر ڈھاتا نہیں — یونہی خوں کے آنسو رُلاتا نہیں

جو پہلے کی اُمّت پہ گذرا کیا — وہ قصّہ کوئی کیوں سُناتا نہیں

اسے آخری زلزلہ مَت سمجھ — یہ مانا کہ یہ روز آتا نہیں

درندے بھی سہمے ہُوئے ہیں مگر — یہ انسان کیوں خوف کھاتا نہیں

کیا ظالموں کی بھی بن آئی ہے — کہ انساں بھی ان کو سُہاتا نہیں

"شری رام" نعرہ لگائیں نہ جو
ریلیف ان کے حصّے میں آتا نہیں

قطعہ

رُوحِ انساں میں ہُوا شیطاں حلول — ساری دُنیا ہو رہی ہے کیوں ملول

اِک طرف جمہُوریت کا جشن ہے — اِک طرف قہرِ الٰہی کا نزول

طفیل چترویدی، نوئیڈا (یو۔پی)

شفا کے لئے

مَیں اپنی زندگی کو چاہتا ہُوں

نام دے دوں اِک نیا، چہرہ نیا دے دوں
پرانا سب تو باسی ہو چلا ہے
سلگتی دُھوپ میں، چادر مرے سَر پر
پڑی تھی جو پُرانی ہو گئی ہے
دُھوپ اب رُکتی نہیں ہے
بُنائی میرے خوابوں کی اُدھڑتی جارہی ہے
مرے اندر کا ڈھانچہ
چاٹتی جاتی ہے دیمک، وقت کی پَل پَل
مرے اندر جو شعلے تھے، نئے پَن کے
اُمیدوں کے، وہ بُجھتے جارہے ہیں
مری سوچوں کے جھرنے تھک گئے ہیں
مرے لفظوں کی گرمی میں بڑی سردی اُترتی جارہی ہے،
مری یادوں کا موسم دُھول کی آندھی نہ بن جائے
مَیں شاید وقت سے پہلے ہی
مرنے کی طرف مائل ہُوں
اِک ایسی موت جس کا مرنے والا
اپنا لاشہ خود اُٹھائے
گھومتا پھرتا ہے دُنیا میں، کہ کوئی قبر مِل جائے
اسی کارن
مَیں اپنی زندگی کو چاہتا ہُوں
نام دے دوں اِک نیا، چہرہ نیا دے دوں
شفا کیا رہے گا!

بدرِ عالم خلش، جمشید پور

سمے بھی ہے مایا

تجھے مَیں نے دیکھا
ترے دیکھنے کو نہ دیکھا
تجھے مَیں نے سوچا
ترے سوچنے کو نہ سوچا
مجھے تو نے چاہا
مری چاہتوں کو نہ چاہا
یہ کہنا کٹھن ہے
کسے کِس نے کھویا
کسے کِس نے پایا
مجازی ہے سب کچھ
یہ دُوری یہ قربت
یہ شکل و شباہت
یہ قد اور قامت
یہ دُھوپ اور سایہ
سمے بھی ہے مایا
یہ تھا، بھی ہے مایا
یہ ہے، بھی ہے مایا
ازل سے یہی ہو رہا ہے، تجھے کیا
ابد تک یہی ہو رہے گا، مجھے کیا

جمال اُویسی، دربھنگا

"زندگی سے اِک مکالمہ"

زندگی تجھ سے مری گفتگو جاری ہوگی
ایک اِک واقعہ پر روشنی لامتناہی
ڈالنی ہوگی مجھے اور تجھے اے پیاری

مَیں وہ تارا جسے کوکب نے تہہ تیغ کیا
اور جو کوکب کا بل نہ کبھی بن پایا
کیسے حالات تھے معلوم ہی ہوں گے تجھ کو
دِل سے آواز اِک آئی تھی کہ تج دو تج دو
پھر بھی جینا مرے معمول میں شامل ہی رہا
جو مرا دل نہیں پایا مرا دل ہی رہا
وہ کڑی رات وہ طوفان تجھے یاد بھی ہے
میری ہستی ہوئی ویران تجھے یاد بھی ہے
آندھیوں نے مری پرداخت میں حصّہ لےکر
ایک دِن چھوڑ دیا غولِ بیاباں دے کر
تو جو کہتی ہے تری دین ہے ہستی میری
کیسے کہہ پاؤں کہاں لائی ہے یورش تیری
تو جسے جرعۂ نایاب سمجھتی ہے کہ ہے
زہر کی بوند ترے شہد سے اچھی ہے کہ ہے
جا مرے خوابوں کے ویرانے میں کچھ دیر ٹہل
یوں مرے سامنے اے زندگی مت اور مچل

ہندی : ارون کنول، پٹنہ
ترجمہ : ڈاکٹر امام اعظم، دربھنگا

شرادھ کا کھانا

(۱)

شرادھ کا کھانا کھا کر لوٹ رہے تیز قدم
دور گاؤں کے دیہاتی زور زور سے باتیں کرتے
کھانے کا ذائقہ مَرنے والے کے عادات واطوار
لگاتے قہقہہ
بھونکتے کتّوں کو پیچھے دوڑاتے
لالٹین لگ بھگ زمین چھوتی
پرچھائیاں چاروں طرف ناچتیں
اُڑاتے دُھول !

(۲)

مشکل ہے نِگلنا شرادھ کا کھانا
قطار میں بیٹھنا
پھر پروسنے والے کا اِنتظار
پھر نوالہ اُٹھانا مَرنے والے کے باپ کے سامنے
مشکل ہے حلق کے نیچے اُتارنا
کوئی اندر دونوں ہاتھوں سے ٹھیل رہا ہے نوالہ
بند ہے گلا
مُنہ چل نہیں پاتا
پلکیں ہِل نہیں رہیں
پالتی میں بھر گئی جانگھ
سامنے کھڑا ہے مَرنے والا ہنستا
پوچھتا، کیسی ہے بندیا کیسا ذائقہ ؟

پروفیسر نظیر صدیقی، اسلام آباد

انشائیہ

آگ وہ گھر میں لگی ہے کہ بجھائے نہ بنے

وہ رات عجیب تھی۔ میرے یارِ غار شمیم صاحب رازدارانہ اعتراف کے موڈ میں تھے۔ کہنے لگے ایک مرتبہ لوگوں کو محبت اور شادی کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے میں یہ کہہ گیا تھا کہ ان خطرات کے معنی یہ نہیں کہ آدمی نہ محبت کرے نہ شادی۔ میری ایک نصیحت یہ ہے کہ "ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو"۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس مصرع کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ اگر دوسروں کے لئے مثال نہ بن سکو تو عبرت ہی سہی۔ اب اسے میری شامت اعمال کے سوا اور کیا کہا جائے کہ میں نے محبت بھی کی اور شادی بھی۔ یعنی محبت کی شادی۔ لیکن دونوں معاملوں میں دوسروں کے لئے مثال بننے کی بجائے درس عبرت بن کر رہ گیا۔

اس اعتراف کے ساتھ ساتھ جی چاہتا ہے کہ ایک اور اعتراف بھی کرتا چلوں۔ وہ یہ کہ جتنی مایوسی مجھے ان سے ہوئی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ مایوسی انہیں مجھ سے ہوئی ہے۔ اگر وہ میرے لئے ایک پسندیدہ بیوی کا عکس معکوس ہیں تو میں بھی ان کے لئے ایک پسندیدہ شوہر کا عکس معکوس ہوں۔ لیکن میرے ایسا ہونے میں میری بد قسمتی کو جتنا بھی دخل ہو میری بدنیتی کا ہرگز کوئی دخل نہیں۔ قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں۔ میں نے ہمیشہ چاہا کہ وہ شادی سے پہلے زندگی کی جن نعمتوں سے محروم رہی ہیں ان سے ان کی زندگی کو مزین اور مطمئن کر دوں۔ لیکن میری بدنصیبی اور ان کی بے سلیقگی نے ایسا نہ ہونے دیا۔ میں نے اپنے سے بدرجہا کم تنخواہ پانے والوں کو آرام و اطمینان کی زندگی بسر کرتے اور ان کی بیویوں کو بہتر پہنتے اوڑھتے پایا۔ لیکن اپنی بیوی کے حسن انتظام کی بدولت نہ میں کبھی اپنے آپ کو مقروض ہونے سے بچا سکا اور نہ انہیں کبھی ویسا کھلا اور پہنا سکا۔ جیسا کہ میں چاہتا تھا یا خود وہ چاہتی تھیں۔ نتیجتاً وہ نہ کبھی مجھ سے خوش رہیں نہ انہوں نے مجھے خوش رہنے دیا۔ وہ میرے برے دنوں کی اچھی ساتھی نہ بن سکیں نہ بن سکتی ہیں۔ البتہ ان میں اچھے دنوں کی اچھی ساتھی بننے کی صلاحیت بدرجہ کمال ہے۔

میری ایک آرزو ہمیشہ یہ رہی کہ اگر میری تنخواہ میں سے ہر مہینے کچھ بچت نہ ہو سکے تو کم از کم

ہر مہینہ میری تنخواہ کے اندر بسر ہو جائے۔ لیکن کبھی ایسا بھی نہ ہو سکا۔ میں جب کبھی ان پر کفایت شعاری کے لئے زور دیتا تو اس دن سے میرے ان کے درمیان بدمزگی کا ہفتہ ضرور شروع ہو جاتا۔ بیوی کفایت شعاری کی تلقین کو اپنی دیانت داری پر ایک الزام سمجھ کر یہ جواب ضرور دیتیں کہ کیا میں آپکے پیسے اپنی ماں بہن کو دے آتی ہوں۔ میں انہیں یہ سمجھانے میں ہمیشہ ناکام رہا کہ اپنی آمدنی کے اندر زندگی بسر کرنے کے لئے دیانت داری ہی نہیں سلیقہ مندی بھی ضروری ہے۔ روپے دیانت داری سے خرچ کئے جائیں یا بددیانتی سے دونوں صورتوں میں ان کا ضروریات کو پورا کئے بغیر خرچ ہو جانا یقینی ہے۔

شادی کے ابتدائی دنوں میں انہوں نے ایک سعادت مند بیوی کی طرح رات کے وقت میری واپسی کا انتظار کرنا شروع کیا۔ لیکن اس میں انتظار کم ہوتا اور سعادت مندی زیادہ۔ یعنی اگر کسی دن میری واپسی میں کچھ زیادہ دیر ہو جاتی تو وہ انتظار کرنے سے زیادہ روہی ہوتیں۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ بعض اوقات مردوں کو واپسی میں دیر بھی ہو جایا کرتی ہے۔ بیویوں کو اس کا برا نہیں ماننا چاہیے۔ پھر یہ کہ میں اپنی زندگی کو دفتر سے گھر تک کس طرح محدود کر لوں۔ ان باتوں کا ان پر اچھا اثر پڑا۔ یعنی بہت جلد انہوں نے میرا انتظار سیرے سے ترک کر دیا بلکہ جس شام میں باہر جاتا اس شام وہ نو دس بجے تک گہری نیند کو دعوت دے کے سو جاتیں۔ میں واپس آتا تو دستک دے دے کر سارے محلے کو جگا دیتا لیکن انہیں جگا نہ پاتا۔ ایک رات دروازے کی کنڈی کھٹکھٹا کھٹکھٹا کر اور انہیں پکار پکار کر تھک گیا۔ آخر کار محلے کے ایک صاحب نے آکر دیوار پھاند کر اندر سے کنڈی کھول دی۔ جب میں اس کمرے میں آکر جہاں وہ سوئی ہوئی تھیں کپڑے بدلنے لگا تو بڑی آہستگی سے آنکھیں کھول کر انہوں نے مجھے دیکھا اور کہا کہ آپ آگئے؟ میں ان کی غیر ضروری بیداری پر حیران رہ گیا۔

اس صورت حال سے خود نجات پانے اور انہیں نجات دلانے کے لئے میں نے ان سے کہا کہ جب رات کو سونے لگو تو دروازے کو صرف مقفل کر دو اور اندر سے اس کی کنڈی نہ لگاؤ تاکہ میں اپنی چابی سے اسے کھول کر اندر آسکوں۔ لیکن یہ اتنی پیچیدہ بات تھی جو ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ چنانچہ دروازے کو مقفل کرنے کے ساتھ ساتھ اندر سے کنڈی لگا دینے کی عادت جہاں کی تہاں رہ گئی۔

اس طرح ان سے میری ایک چھوٹی سی درخواست بھی ہمیشہ رائیگاں گئی۔ میں نے ان سے التجا کی کہ فیرنی اور سالن وغیرہ میں چاہو تو زہر ڈال دو لیکن لونگ اور الائچی نہ ڈالا کرو۔ وہ

کم از کم ایک لونگ یا الائچی ڈالے بغیر نہ رہتیں۔ حسنِ اتفاق یہ کہ وہ ایک لونگ یا الائچی میرے ہی کھانے میں یا تو میری نظر کے سامنے آجاتی یا دانتوں تلے آجاتی۔ جب ان کی اِس عادت کو پُورے دس سال گذر گئے تو ایک دن مجھے کہنا پڑا کہ اگر مَیں کسی کی بیوی ہوتا تو اتنی سی بات ماننے میں مجھے دس سال نہ لگتے۔ اللہ کے فضل و کرم سے میرے ان کے ازدواجی تعلقات بہت جلد صرف اقتصادی تعلقات میں منتقل ہو کر رہ گئے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ انہوں نے اقتصادی تعلقات کی ضرورت اور اہمیت کو بھی یکسر نظر انداز کر دیا۔ ان کا طرزِ عمل ایسا ہے جیسے کیا ہو گا اگر تم نہ ہو گے۔ آخر غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں۔

میری شوہرانہ وفاداریوں کے بارے میں اُنھوں نے بہت سے شکوک پال رکھے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ مَیں اپنے زمانے کا ڈون ژون ہوں اور اپنی تنخواہ کا بیشتر حصّہ اپنے معاشقوں پر صَرف کرتا ہُوں۔ جب وہ مجھ سے میری شوہرانہ بے وفائیوں کا اِنتقام لینا چاہتی ہیں تو کہتی ہیں خدا کرے آپ کی بیٹیوں کو آپ جیسا شوہر ملے۔ یہ بَددُعا دیتے وقت وہ ہمیشہ یہ بھُول جاتی ہیں کہ بیٹیاں صرف میری نہیں اُن کی بھی ہیں۔ یا یہ کہ وہ جتنی میری ہیں اتنی ہی ان کی بھی ہیں۔ بہر حال جب وہ ہزار بار مجھے یہ بد دعا دے چکیں تو ایک مرتبہ میری زبان سے بھی یہ دُعا نکل گئی۔ خدا کرے میری بیٹیوں کو میرے جیسا شوہر ملے۔ لیکن میرے بیٹے کو تم جیسی بیوی نہ ملے۔

ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ بسا اوقات یا تو ان کی صحت خراب رہتی یا موڈ خراب رہتا ہے مجھے آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ آیا صحت کی خرابی کے باعث ان کا موڈ خراب رہتا ہے یا موڈ کی خرابی کے باعث ان کی صحت خراب رہتی ہے۔ صحت کی خرابی کے سلسلے میں ان کا اور ان کے عزیزوں کا نظریہ یہ ہے کہ تاریخی اِعتبار سے یہ خرابی ان کی شادی کے بعد شروع ہُوئی۔ ویسے میرا حافظہ یہ کہتا ہے کہ شادی سے پہلے بھی وہ حسینہ کم اور مریضہ زیادہ تھیں۔ بہر حال مَیں اِس معاملے کو یہیں چھوڑتا ہُوں۔ ممکن ہے آئندہ محققین اس مسئلے پر مجھ سے بہتر روشنی ڈال سکیں۔

صحت کی خرابی کے باعث آئے دن انہیں جسم کے کسی نہ کسی حصّے میں درد ہوتا رہتا ہے اِس صُورتحال کو دیکھ کر ایک دِن مَیں نے کہا۔ اگر آپ کو "دیوانِ درد" کہا جائے تو غلط نہ ہو گا؟ لیکن یہ خطاب پا کر وہ مجھ سے اور زیادہ خفا ہو گئی ہیں۔ ان کی شاپنگ کا طریقہ میرے اور بچّوں کے لئے نہایت صبر آزما اور دُکانداروں کے لئے حد درجہ اشتعال انگیز ہے۔ اگر انہیں دو چار گز کپڑے خریدنے ہوں،

جب بھی وہ بیسیوں تھان کھلوا دیں گی۔ اس کے بعد یہ کہکر ایک دُکان سے دُوسری دُکان میں چلی جائیں گی کہ اچھا پھر اطمینان سے آؤں گی۔ بعض اَوقات میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا رہا ہے کہ اگر عورت کی محبوب ترین قسم محبوبہ ہے تو کیا عورت کی مکروہ ترین قسم منکوحہ کہی جاسکتی ہے؟ اِس بارے میں اگر میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکا ہُوں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ سُنا ہے بعض بیویوں کا وجود میرے اس کلیے کی تردید کرسکتا ہے کہ عورت کی مکروہ ترین قسم منکوحہ ہوتی ہے۔

مجھے ان لوگوں پر ہمیشہ حیرت ہوتی رہی ہے جو ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کی ہمّت کا ثبوت دیتے رہے ہیں۔ اور حیرت کیوں نہ ہو جب کہ میرا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ زندگی کو بنانے کے لئے چار بیویاں بھی کافی نہیں۔ البتّہ اسے بگاڑنے کے لئے ایک بیوی بھی کافی ہے۔ بیوی کے لئے ہمارے زبان اور تہذیب میں شریکِ حیات اور رفیقۂ حیات کی اِصطلاحیں استعمال ہوتی رہی ہیں اور یہ اصطلاحیں ہمیشہ ہم معنی سمجھی گئی ہیں۔ مجھے ان لوگوں کی قسمت پر ہمیشہ ترس آتا ہے جن کی بیویاں شریکِ حیات ہو تو ہوں رفیقۂ حیات ہرگز نہیں ہوتیں۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ اچھی بیوی کی پہچان کیا ہے تو میں اِتنا ہی کہوں گا کہ اچھی بیوی وہ ہے جس کے طرزِ عمل سے شوہر کو یہ محسوس ہو کہ بیوی اس کی زندگی کا بہترین انعام ہے نہ کہ اس کا غلط ترین فیصلہ۔ میں محبوبہ اور منکوحہ کے درمیان موازنہ انیس و دبیر کا قائل نہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ محبوبہ کی ناکامی یہ ہے کہ صرف بیوی بن کر رہ جائے۔ اور بیوی کی کامیابی یہ ہے کہ وہ محبوبہ کی حیثیت اِختیار کرلے۔

شمیم صاحب کو لکھنے پڑھنے کا بڑا سُتھرا ذوق تھا۔ کئی ایسی کتابوں کے مصنّف تھے جن کی وجہ سے اُن کا شمار جانے پہچانے لکھنے والوں میں ہوتا تھا۔ ان کی تقریباً ہر کتاب میں اِنتساب ضرور ہوتا جب وہ دُوسرے اہلِ قلم کی کتابوں میں دیکھتے کہ ان کی کتاب کا اِنتساب اپنی بیوی کے نام ہے جس کی بدولت صاحبِ کتاب کو لکھنے میں مناسب ماحول اور ضروری مدد ملی تو ان کے دِل میں حسرت کی ایک لہر ضرور پیدا ہوتی، کاش میں بھی اپنی کسی کتاب کا انتساب اپنی بیگم کے نام کرسکتا۔ لیکن ان کی یہ حسرت کبھی پوری نہ ہوسکی۔ میں نے کئی مرتبہ شمیم صاحب کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنی کسی ایک کتاب کا انتساب اپنی بیگم کے نام کردیں تاکہ ان کی آرزو پوری ہوجائے۔ لیکن ان کا عُذر یہ تھا کہ بیگم کے نام انتساب جن الفاظ کے ساتھ ممکن ہے وہ ان کی ازدواجی زندگی کے لئے مُفید ہونے کی بجائے مضر ثابت ہوں گے۔ میں نے پُوچھا آخر آپ کے نزدیک بیگم کے نام انتساب

کن الفاظ کے ساتھ ممکن ہے؟ انہوں نے کہا بھئی! میرے ازدواجی حالات اور تعلقات جیسے رہے ہیں ان کے اعتبار سے اِنتساب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ

اپنی رفیقۂ حیات کے نام جن کے باوجود یہ کتاب لکھی جا سکی۔

یہ مسئلہ محققوں کے لئے ایک (جاندار) موضوع کی حیثیت رکھتا ہے کہ بیوی کے بارے میں شمیم صاحب کی رائے اس لئے غیر موافقانہ تھی کہ خود عورت کے بارے میں ان کی رائے غیر موافقانہ تھی یا عورت کے بارے میں ان کی رائے بیوی سے متعلق رائے کا منطقی نتیجہ تھی۔ بہر حال مجھے ان کی باتوں سے کبھی کبھی یہ اندازہ ضرور ہوا کہ نہ صرف بیوی بلکہ خود عورت کے بارے میں ان کی رائے عورتوں کے سننے کے لائق نہیں رہ گئی تھی۔

ایک مرتبہ جب ایک پڑھی لکھی خاتون نے کسی معاملے میں ازراہِ مذاق کہا کہ آپ مرد بڑے نامعقول ہوتے ہیں تو انہوں نے برجستہ جواب دیا کہ اگر ہم مرد نامعقول نہ ہوتے تو قدرت آپ عورتوں کی شکل میں نامعقول تر مخلوق کیونکر پیدا کرتی۔

شمیم صاحب کبھی بیمار پڑتے تو بیگم سے اتنی توقع رکھتے کہ وہ دوا اور غذا کے لئے پوچھ لیا کریں گی۔ لیکن جب انہیں اس توقع میں مایوسی ہوتی یعنی وقت پر نہ دوا ملتی نہ غذا تو وہ بیگم سے اتنی شکایت ضرور کرتے کہ کیا اتنا بھی ممکن نہیں کہ دو منٹ کے لئے میرے کمرے میں آ کر میری ضرورت مجھ سے پوچھ لو۔ اس پر ان کی بیگم گھر کے کام کاج کا عذر پیش کر دیتیں۔ ایک مرتبہ جب ان کی بیگم نے اسی طرح کا عذر پیش کرتے ہوئے کہا کہ گھر ہی کی صفائی میں لگی ہوئی تھی۔ کہیں تفریح کے لئے تو نہیں گئی تھی۔ تو شمیم صاحب نے کہا۔ گھر کی صفائی ضرور ہونی چاہیئے۔ لیکن گھر کی صفائی میں میرا صفایا تو نہیں ہونا چاہیئے۔

شمیم صاحب کا چار سالہ بیٹا کبھی کبھی اپنے بھولے پن میں اپنی ماں سے کہتا۔ امّی کھانا مت پکائیے۔ ہم ایک اور امّی لے آئیں گے وہ کھانا پکائیں گی۔ ایک دن بیگم شمیم اپنے بیٹے کے اس جملے سے محظوظ ہو کر کہنے لگیں۔ ہاں بیٹا! بیویاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک ہاؤس وائف اور دوسری ڈرائنگ روم وائف۔ تمہارے ابّو نے ہم کو صرف ہاؤس وائف بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس پر شمیم صاحب نے بیگم سے کہا۔ ہاں مجھے بھی اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ اگر صرف ڈرائنگ روم وائف ہوتیں تو بہت کامیاب وائف ہوتیں۔ گھر کو سجانا زندگی کو سجانے سے زیادہ آسان ہے۔ اتنا ہی آسان جتنا کہ کسی بھی مشکل صورتحال سے دوچار ہوتے وقت بدحواسی یا برہمی کا ثبوت دینا جو آپ کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

شمیم صاحب زندگی بھر جن اُلجھنوں میں مبتلا رہے ان میں سے ایک اُلجھن یہ تھی کہ شادی شدہ

لڑکیاں زیادہ تر اپنی ماں کے ہاتھوں تباہ ہوتی ہیں یا اپنی ساس کے ہاتھوں۔ اُنہیں کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ بہو کی زندگی کو تباہ کرنے میں جس قدر غلط قسم کی ساس کو دخل ہوتا ہے کم و بیش اِتنا ہی دخل بیٹی کی زندگی کو تباہ کرنے میں غلط قسم کی ماں کو ہوتا ہے۔ شمیم صاحب کے اس تاثر کے پیچھے ان کے اِس تجربے کو دخل تھا کہ خود ان کی بیگم کی گمراہی اور غلط اندیشی میں ان کی والدہ ماجدہ کے بعض مخصوص نظریات کا بڑا حِصّہ تھا۔ مثلاً بیگم شمیم کا ایک محبوب خیال یہ تھا کہ اگر قسمت اچھی ہو تو پھوہڑ سے پھوہڑ بیویوں کو چاہنے والے شوہر مِل جاتے ہیں یا بہ الفاظِ دیگر اگر شوہر اچھا ہو تو پھوہڑ سے پھوہڑ بیویوں کو سَر کا تاج بنائے رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے خرابی یا تو انہیں اپنی قسمت میں نظر آتی تھی یا شمیم صاحب میں۔ اسی طرح ان کا ایک خیال یہ تھا کہ ان کی صحت کی خرابیوں کا اصل سبب یہ تھا کہ انہیں شمیم صاحب کے دوستوں اور ملنے والوں کے لئے یا تو چائے بنانا پڑتی تھی یا ان کی دعوتوں کے سِلسلے میں کھانا پکانا پڑتا تھا۔ یہ اور اسی طرح کے کئی اور نظریات بیگم شمیم کو اپنے میکے سے تحفے میں ملے تھے۔ ان نظریات نے انہیں کبھی اِس بات پر غور نہیں کرنے دیا کہ ان کی قسمت یا صحت کی خرابی میں خود ان کی ذات کو کوئی دخل ہے یا نہیں۔

شمیم صاحب سے تمام عمر بیگم شمیم کی کمزوریوں کا شکایتیں سُننے کے باوجود یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ بدنصیب دونوں ہی ہیں۔ شمیم صاحب کا المیہ یہ تھا کہ اُنہوں نے شادی کی اور بیگم شمیم کا المیہ یہ کہ انہوں نے شمیم صاحب جیسے آدمی سے شادی کی۔ بیگم شمیم کو ایک قلق یہ تھا کہ شمیم صاحب ان کی عزّت نہیں کرتے۔ اس الزام کے جواب میں شمیم صاحب کا کہنا یہ تھا کہ جو لوگ عزّت کے قابل ہیں ان کی عزّت کرتا ہوں۔ لیکن جو عزّت کے قابل نہیں ہیں اُن کی بے عزّتی بھی نہیں کرتا۔ بیگم شمیم عزّت نہ کرنے کو اپنی بے عزّتی پر محمول کرتی تھیں۔ انہیں یہ سمجھانا ممکن نہ ہو سکا کہ حاکموں اور حکمرانوں کے سِوا باقی لوگوں کی عزّت اس وقت کی جاتی ہے جب ان میں کوئی خوبی ہوتی ہے۔ سچّا احترام بے ساختہ ہوتا ہے نہ کہ نافذ کردہ عزّت اور محبّت اِنسان کے بُنیادی حقوق میں سے نہیں ہیں جو ہر حال میں ہر طرح کے اِنسان کو ضرور مِل جانے چاہئیں۔ خواہ وہ اس کا اہل ہو یا نہ ہو۔

شمیم صاحب اور بیگم شمیم کے درمیان آئے دن فسادات بر پا ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے فوری اسباب جو بھی ہوں لیکن ان کا بُنیادی سبب ہمیشہ اقتصادی ہوتا تھا۔ کم از کم میرا ذاتی تجربہ یہی کہتا ہے۔ شمیم صاحب کی آمدنی بیگم شمیم کی خواہشات، ضروریات اور مطالبات سے ہمیشہ کم رہی۔ نتیجتاً شمیم صاحب بیگم کی بہت سی خواہشات کو ٹالتے رہتے لیکن آخر بیگم شمیم بھی اِنسان ہی تھیں۔ وہ کہاں تک صبر و قناعت سے

کام لیتیں۔ انہیں تو یہ احساس بھی کھائے جاتا تھا کہ اگرچہ ان کی بعض خواہشات پوری ہوئیں لیکن بروقت پوری نہ ہوئیں۔ یعنی اس وقت پوری ہوئیں جب ان کی عمر ڈھلنے لگی۔ بیگم شمیم کا یہ احساس شمیم صاحب کے اس اطمینان کو مجروح کر ڈالتا کہ میں نے بیگم کی کوئی دیرینہ آرزو پوری کر دی۔ میں نے ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک مرتبہ شمیم صاحب کو مشورہ دیا کہ اگر آپ سکون و اطمینان کی ازدواجی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں تو ایک سیدھے سادھے اصول کو ضرور اپنا لیجئے۔ وہ یہ کہ اگر آپ کی ماہانہ آمدنی دو ہزار روپے ہے تو ہر مہینے دو ہزار میں سے کم از کم چار ہزار روپے خرچ کر دیا کریں۔ اس طریق کار کی بدولت کسی بحران کا سامنا ہو تو ہو گھر میں کسی طوفان کا سامنا ہرگز نہ ہوگا۔ شمیم صاحب نے میرے اس مشورے کو گرہ میں باندھ لیا تھا لیکن اس پر عمل کبھی نہ کر سکے۔ وجہ ظاہر ہے۔

شمیم صاحب کی ایک بدنصیبی یہ تھی کہ کم از کم وہ اس بات کو اپنی بدنصیبی ہی سمجھتے تھے کہ ان کی سسرال اور ان کے گھر کا درمیانی فاصلہ ہمیشہ آدھا فرلانگ رہا۔ ان کے سکون کو غارت کرنے کے لئے ان کی بیگم کا انداز فکر ہی کچھ کم نہ تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ان کی بیگم کو اس معاملے میں اپنے گھر والوں کی طرف سے مزید کمک ملتی رہتی تھی۔ شمیم صاحب کے یہاں سسرال کی طرف سے چیزوں کے تحفے تحائف تو کبھی آتے نہ تھے البتہ بیگم شمیم کے لئے نئے خیالات کے تحفے ضرور آتے رہتے تھے۔ نئے خیالات کی شکل میں شمیم صاحب کی جان ناتواں پر جو نئے دباؤ پڑتے رہتے تھے اس سے وہ بہت عاجز تھے۔ دو چار مرتبہ انہوں نے اپنی بیگم سے استدعا کی کہ وہ میکے کی طرف سے نئے خیالات قبول نہ کیا کریں۔ ان سے ہماری زندگی میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اس قسم کی اپیل سے ان کی ذاتی صورت حال میں مزید خرابی پیدا ہوتی چلی گئی۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ جب شمیم صاحب اپنی کسی اضافی آمدنی سے قالین، ٹی وی ٹیپ ریکارڈر وغیرہ خرید چکے تو فریج کی پرانی فرمائش میں نئی شدت پیدا ہو گئی۔ شمیم صاحب سوچ ہی رہے تھے کہ فریج کی خریداری کا انتظام کس طرح کیا جائے کہ ایک دن بیگم شمیم کے اکلوتے بھائی ان کے یہاں آئے۔ اور بغیر مانگے یہ مشورہ دے گئے کہ آپ کی تنخواہ اتنی ہے۔ بینک سے آپ کو اتنے روپے آسانی سے قرض مل جائیں گے۔ لہذا آپ فریج خرید ہی لیں۔ شمیم صاحب کو ذاتی معاملات میں اس قسم کی مداخلت اچھی نہ لگی۔ انہوں نے بعد میں بیگم سے کہا کہ تمہارے بھائی کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اتنا کہنا تھا کہ زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے، والا مصرع پورے ڈرامے کی شکل میں ان کے سامنے آ گیا۔ ان کی بیگم ملتجیانہ انداز میں کہنے لگیں۔ خدا کے واسطے اس کو برا نہ کہئے۔ وہ ایک ہی ہے

آپ لوگ چھ بھائی تھے۔ ایک کے مرنے کے بعد بھی پانچ رہ گئے ہیں۔ شمیم صاحب نے اس موقع پر پوری سنجیدگی سے بیگم کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اول تو ہم تمہارے بھائی کا برا نہیں چاہتے۔ ہم صرف یہ کہنے کے گنہگار ہیں کہ فریج کے لئے وہ جس طریقے سے مشورہ دے گئے ہیں وہ غلط ہے، دوسرے یہ کہ وہ اگر تمہارے بھائی کی حیثیت سے اکلوتے ہیں تو میں بھی تمہارے شوہر کی حیثیت سے اکلوتا ہوں۔ اگر میں مر جاؤں تو کیا تمہیں اس خیال سے تسلّی ہو گی کہ چلو پانچ بھائی تھے، اگر ایک نہ رہا تو کیا ہوا۔ لیکن بیگم شمیم پر اس فہمائش کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ان کا طرزِ عمل ہمیشہ یہی ظاہر کرتا رہا کہ ان کے نزدیک بھائی کا اکلوتا پن تو معنی رکھتا ہے لیکن شوہر کا اکلوتا پن کچھ معنی نہیں رکھتا۔

شمیم صاحب کی تلخ زندگی کو تلخ تر بنانے میں ان کے سسرال نے جو کردار انجام دیا اس کی بنا پر وہ اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ شادی کرتے وقت لڑکی سے زیادہ لڑکی کے خاندان کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنی چاہئیں۔ شادی کی کامیابی کا دارومدار لڑکی کی خوبیوں پر نہیں، ان کے خاندان کی خوبیوں پر ہے دراصل لڑکی کی خوبیاں بھی اس کے خاندان کی خوبیوں پر منحصر ہیں۔ خاندان کا حسن سیرت بیوی کے حسن صورت کی کمی کی تلافی کر سکتا ہے۔ لیکن بیوی کا حسن صورت خاندان کے حسن سیرت کی کمی کی تلافی ہرگز نہیں کر سکتا۔

شمیم صاحب بتلاتے تھے کہ میرے اور اپنے بارے میں ان کے بعض تصورات بڑے سیدھے سادھے ہیں۔ میرے بارے میں تو ان کا تصور یہ تھا کہ میں دنیا کا سب سے بڑا ظالم آدمی یا ظالم شوہر ہوں۔ اپنے بارے میں ان کا تصور یہ تھا کہ وہ دنیا کی سب سے مظلوم عورت یا مظلوم بیوی ہیں۔ مظلومیت کی ایک پہچان یہ ہے کہ آدمی کسی دست درازی کا شکار ہو۔ شمیم صاحب جیسے انسان سے توقع نہیں کی جا سکتی کہ اور تو اور وہ اپنی شریک حیات کے معاملے میں دست درازی کے مجرم ہو سکتے ہیں۔ ہاں وہ اپنی شریک حیات کی زبان درازی کے شکار عمر بھر رہے۔ ان کی بیگم کو کبھی محسوس نہ ہو سکا کہ زبان درازی اور تلخ کلامی کی تباہ کاریاں ایٹم بم سے کم نہیں ہوتیں۔

شمیم صاحب کی بیگم نے ان کے قریب ترین اعزا (ماں، بھائی، بہن وغیرہ) کی انسانی کوتاہیوں کی بنا پر ان سے ترک تعلق میں بھی دریغ نہیں کیا بلکہ انہیں یہ شکوہ بھی رہا کہ خود شمیم صاحب اپنے عزیزوں سے ترک تعلق کیوں نہیں کر لیتے۔ بہرحال انہوں نے اتنا ضرور کیا کہ اپنے قریب ترین عزیزوں پر اپنے گھر کا دروازہ یہ کہہ کر خود بند کر دیا کہ جس گھر میں عزت اور محبت کے ساتھ آنا ممکن نہ ہو وہاں آنا کیا ضرور۔ اپنے عزیزوں کے ساتھ اس سلوک کے باوجود اپنے سسرالی اعزہ پر اپنے گھر کا دروازہ ہمیشہ

کھلا رکھا۔ ان کے ساتھ اپنے اس اخلاق کو بھی قائم رکھا جو روز ازل سے ان کے لئے مخصوص تھا۔ ایک دن کسی خفگی کے دوران بیگم شمیم نے یہ کہہ کر اپنے خستہ حال ضمیر کو مطمئن کرلیا کہ اگر آپ ہمارے عزیزوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں تو اسے ہم پر احسان تصور نہ کیجئے گا۔ آپ کی خوش اخلاقی ہمارے عزیزوں پر احسان ہو تو ہو ہم پر احسان نہیں ہے۔

پچیس سال کی ازدواجی زندگی کے بعد ایک دن بیگم شمیم کی زندگی میں ایک ایسا لمحہ بھی آیا جب انہوں نے محسوس کیا کہ شمیم صاحب کے ساتھ وہ زیادتی کر بیٹھی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے لمحۂ ندامت میں شمیم صاحب سے معافی مانگی۔ شمیم صاحب جواب میں یہ مصرع پڑھ کر خاموش ہو گئے۔ ع

چڑھی ندی اتر گئی پر گھر ہو گئے ویران

تبصرے

نام کتاب : **حصارِ درد** (شعری مجموعہ)

شاعر : حسن امام درد قیمت : سو روپے سال : ۲۰۰۰ء

ناشر : امیر منزل، قلعہ گھاٹ، دربھنگا۔ ۴ (بہار)

مبصر : ابو اللیث جاوید، مظفر پور

حسن امام درد ۴۰۔ ۱۹۳۹ء سے ہی اشعار کہہ رہے ہیں اور چند اچھے افسانے بھی لکھ چکے ہیں۔ ان کے افسانے ۱۹۴۴ء اور ۱۹۵۳ء کے درمیان کلکتہ اور پٹنہ سے شائع ہونے والے مختلف جرائد و اخبارات میں شائع ہوئے۔ بعد میں انہوں نے افسانہ نگاری ترک کر کے شاعری شروع کر دی۔ ۱۹۵۷ء میں ان کی ایک غزل ترقی پسند ماہنامہ 'شاہراہ' میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں شامل ان کے پیش لفظ 'اپنی بات' سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ یہ مارکسی نظریۂ حیات کے حامی رہے اور کمیونسٹ پارٹی میں بہت فعال بھی رہے۔ ۱۹۴۵ء میں کانگریس پارٹی کے کارکن بھی بنے۔ اور چند اہم کانگریسی رہنماؤں سے گہرے روابط بھی رہے۔ تقسیم ملک کے وقت فرقہ وارانہ فسادات اور باہم تعصبات کے پیش نظر پھر سے کمیونسٹ پارٹی میں مراجعت کی اور اسی کے ہو رہے۔ حالانکہ اس سیاسی رویّہ کی وجہ کر ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اور پھر مختلف کمپنیوں کے ساتھ مختلف جگہوں کی خاک چھاننی پڑی۔

اپنی شاعری کے متعلق لکھتے ہیں:۔ "میری شاعری آدھی صدی پر محیط ہے۔ میں نے اپنی روایات سے رشتہ برقرار رکھتے ہوئے، تمام عصری ادبی رویوں سے استفادہ کیا ہے، جو میری شاعری میں رچ بس گئے ہیں۔ میں نے قرآن سے بھی جلال و جمال اخذ کیا ہے جس میں کہا گیا ہے۔ یہ آیتیں اللہ کے حسن اور نور سے انسان کی فطرت کے رشتے کے تحرک سے کائنات کے جلال و جمال کا بلیغ احساس دلاتی ہیں۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس نے جو چیز بھی بنائی خوبصورت بنائی، تمہاری کیا حسین صورتیں خلق کیں۔ بلاشبہ ہم نے انسان کی فطرت کو حسین بنایا ہے۔ اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے انسانوں کی فطرت تخلیق کی، میری شاعری میں کہیں کہیں اس حسن و جمال کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔" ان کے اس بیان سے ان کی شاعری کو سمجھنا بالکل آسان ہو جاتا ہے

ان کی شاعری کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ انہوں نے مذہب کو ترقی پسندوں کی نگاہ سے قطعی نہیں دیکھا ہے اور اسلامی تعلیمات سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اپنی زندگی کو انہیں تعلیمات کے تابع کیا ہے اور شاعری کے لئے روشنی بھی حاصل کی ہے اپنی شاعری کو سیاسی پروپیگنڈہ اور اشتہار بازی نہیں بننے دیا ہے۔ ایسے میں ان کے کردار کا سب سے تابناک پہلو مانتا ہوں۔ انہوں نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ سیاست اور مذہب دو مختلف نظریے ہیں۔ اور کسی خاص سیاسی نظریے کے طرفدار ہو کر اپنے مذہب سے غافل ہو جانا محض نادانی ہے۔ انہوں نے مارکسی نظریے کو انسانیت کے لئے ایک اصول تو ضرور مانا ہے مگر خدائے بزرگ و برتر کی عظمت تمام دنیاوی بڑائیوں سے کہیں زیادہ بلند و بالا تسلیم کرتے ہوئے اپنی روایات سے رشتہ برقرار رکھا ہے

چلیں خلوص سے سب حکم پر شریعت کے　　یہی ہے روح حقیقت کو جان جانے کی

حسن امام درد نے 'اپنی بات' میں مارکسی ادب، جدیدیت اور تصوف کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی سیاسی / ادبی رویّہ سے متاثر ہو کر ادب کی تخلیق نہیں کی ہے بلکہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ـــــ 'جو کچھ بھی کاوش مجھ سے ہو جاتی ہے' وہ اسی کارساز کا کرشمہ ہے کیونکہ اکثر کام بے اختیاری میں ہوتے ہیں' یہ بہت بڑی بات ہے۔

پورے مجموعے میں ایسا کوئی بھی شعر نہیں ملتا جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہ کسی خاص سیاسی نظریہ کے تحت کہا گیا ہے۔ پوری کی پوری شاعری ایک بے قرار دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔

ہم انتظار میں ہیں اک نئی کرامت کے　　نہ جانے حضرتِ مہدیؑ کا کب کرم ہوگا

زمانہ پھر کسی منصور کی تلاش میں ہے　　یہ وقت وہ ہے کہ دار و رسن کی بات کریں

خزاں پسند ہو خود باغباں تو ہم کیسے　　فروغِ گل کی، بہارِ چمن کی بات کریں

اے درد عمر بھر نہ میں تقلید کر سکا　　حالانکہ سیکڑوں ہی مجھے راہ بر ملے

اُس کے عزم میں شامل کل جہان تھا　　جُوئے شیر لانے میں کب تھا کوہکن تنہا

احساس کی صلیب پہ خود کو چڑھا دیا　　گلنار اپنے ہاتھ کی تحریر بن گئی

اس کے علاوہ اور بہت سارے خوبصورت اشعار حسن امام درد کے درد کو نمایاں

کرتے ہوئے ہمیں یہ بتلاتے ہیں کہ ایک سچّا شاعر اپنی شہرت سے بے نیاز حقیقی شاعری کرنے میں اپنی عمرِ عزیز لگا دیتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں حسن امام درد کا قد نہایت بلند و بالا محسوس ہوتا ہے۔

نام کتاب : نصف ملاقات (مرحوم مشاہیر ادب کے خطوط مظہر امام کے نام)

مرتب : ڈاکٹر امام اعظم

قیمت : ۱۲۰ روپے سال: ۱۹۹۴ء

ناشر : اردو ادبی سرکل، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ

مبصّر : ابو اللیث جاوید، مظفر پور۔

نصف ملاقات، مظہر امام کے نام مشاہیر ادب کے لکھے ہوئے خطوط کا مجموعہ ہے۔ جسے ڈاکٹر امام اعظم نے ترتیب دیا ہے۔ مرتب کے مطابق ۴۶ء سے ۷۵ء کے درمیان موصول شدہ خطوط کا انتخاب ہے۔ اور مظہر امام کے کشمیر کے قیام کے دوران موصول ہونے والے خطوط اس میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔ مکتوب دراصل دو شخصیتوں کے درمیان گفتگو کا تحریری دستاویز ہوتے ہیں۔ جس سے مکتوب الیہ اور مکتوب نگار دونوں کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کی عکاسی ہوتی ہے۔ چونکہ شعراء و ادباء اپنی شخصیت کو اپنی تخلیقات کے پردے میں پوشیدہ رکھنے کے قائل ہوتے ہیں، اس لئے ان کے یہ خطوط اُن کے مزاج، کردار اور شخصیت کے بیشتر گوشوں کو نمایاں کرنے کا کارآمد کام انجام دیتے ہیں۔ یہی نہیں یہ مکاتیب اپنے وقت کے ادبی، سماجی، سیاسی اور ثقافتی حالات کا بھی آئینہ دار ہوتے ہیں۔

اُردو میں مکتوب نگاری کی روایت بہت پرانی ہے۔ تحقیق کی روشنی میں یہ کہا جاتا ہے کہ ۱۷۶۱ء کے قبل مرزا یار علی جنگ نے میر ابراہیم جیو کے نام ایک منظوم خط لکھا تھا جس کا ثبوت ادارہ ادبیات اُردو، حیدر آباد سے فراہم ہوتا ہے۔ اسی طرح مرزا غالب اور ان کے معاصرین رجب علی بیگ سرور، غلام غوث بے خبر اور غلام امام شہید کے نام بھی ابتدائی دور کے مکتوب نگاروں میں ملتے ہیں۔ غالب کے خطوط کو تو اُردو نثر کے شہ پارے کا درجہ مل چکا ہے۔

مکتوب نگاری کی یہ روایت واجد علی شاہ سے ہوتی ہوئی مولانا ابوالکلام آزاد تک اور پھر دورِ حاضر کے بیشتر فنکاروں تک پہنچتی ہے۔

پیشِ نظر کتاب اس لئے بھی اہم ہے کہ اس میں شامل خطوط کم و بیش تیس ۳۰ برسوں پر محیط ہیں۔ جو ملک کے نہایت ہی انقلابی و بحرانی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ملک کے حالات کیا کیا کروٹیں بدل رہے تھے اور دانشور طبقہ اس سے کتنا متاثر تھا' اس کا پورا نقشہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ویسے تو اس کتاب میں شامل سبھی خطوط اہم ادبی شخصیتوں کے افکار کے نمائندہ ہیں مگر جناب سہیل عظیم آبادی اور جناب ارشد کاکوی کے مراسلے زیادہ دلچسپ اور اہم ہیں۔ ان حضرات سے مکتوب الیہ کی ذاتی وابستگی کا احساس ہوتا ہے۔ ساتھ ہی بعض اہم ادبی معرکوں کی بھی تفصیل ملتی ہے۔ منظر امام نے اپنا ادبی سفر افسانہ نگاری سے شروع کیا۔ اور پھر شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ ترقی پسند ادبی تحریک میں پیش پیش رہے اور پھر بعد میں جدیدیت سے بھی اپنا رشتہ استوار رکھا۔ آزاد غزل کے موجد کی حیثیت سے بھی جانے گئے اور ایک اچھے نثر نگار ہونے کا بھی ثبوت دیا۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی ملا۔ اور ایک اہم شاعر تسلیم کئے گئے۔ ظاہر ہے ان معاصرین میں اردو ادب کی اہم شخصیتیں شامل ہیں جن سے ان کے اچھے مراسم بھی ہیں یہی وجہ ہے کہ پیشِ نظر کتاب میں ان تمام مشاہیرِ ادب کے خطوط شامل ہیں' اس اعتبار سے کہ ان تیس برسوں کا ادبی و سیاسی منظر نامہ بڑی آسانی سے مرتب ہو جاتا ہے' یہ کتاب نہایت اہم ہے۔ ان مراسلوں کے مطالعہ کے وقت میرے ذہن میں چند باتیں آئی ہیں جنھیں میں مشورۃً مرتب کی نذر کرنا چاہتا ہوں تاکہ آنے والے وقتوں میں اگر خطوط پر مشتمل کوئی کتاب مرتب کی جائے تو ان نکات پر خاص توجہ دی جائے۔

۱۔ مکتوب نگار کی مختصر سوانح اور ان کی ادبی نگارشات کی تفصیل دی جائے تو قاری کو مراسلہ کے سمجھنے میں بڑی آسانی ہوا ور (۲) مراسلہ کے ساتھ مکتوب الیہ کا جواب بھی شامل کیا جائے تاکہ یہ آدھی ملاقات آدھی گفتگو بن کر نہ رہ جائے ایسا کرنے سے مراسلوں کو پڑھتے وقت جو ایک ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے وہ ختم ہو جائے۔ 'نصف ملاقات' مرتب کرکے ڈاکٹر امام اعظم نے ایک بہت ہی اہم کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ اس کی قدر ہونی چاہیے۔

نام کتاب : **عورت** (افسانوی مجموعہ)

مصنّف : اقبال انصاری قیمت : ایک سو پچاس روپے ۱۵۰/

ناشِر : محمد شیراز - الیف ۱۷۶، پانڈو نگر، دہلی - ۹۱ اشاعت : ۱۹۹۹ء

مُبصّر : ابوالّلیث جاوید، مظفر پور

اقبال انصاری کو مَیں نے پہلی بار ماہنامہ 'آج کل' دہلی میں پڑھا تھا۔ کہانی کا تیور بڑا انوکھا تھا۔ پھر ان کی دو تین کہانیاں نظر سے گذریں۔ اس بار بھی اقبال انصاری نے مجھے اپنی طرف چونکا دینے والی حد تک متوجہ کیا۔ ان کی زبان بالکل سیدھی سادی مگر ٹریٹمنٹ میں غضب کا تنوع اور کہانیوں کا ماحول بالکل قدرتی۔ پلاٹ خود بخود جیسے اختتام کی طرف رواں دواں ہو اور قاری اُسکا آخر تک تعاقب کرنے پر مجبور ہو۔ قاری کی اسی مجبوری کو میں افسانہ نگار کی سب سے بڑی کامیابی تصوّر کرتا ہوں۔

اقبال انصاری کا زیرِ نظر افسانوی مجموعہ 'عورت' اٹھارہ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ ان افسانوں کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ ان کے ذریعہ عورت کے کسی نہ کسی نفسیاتی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اُردو کے تقریباً سبھی معروف افسانہ نگاروں نے عورت ہی کو موضوع بنا کر افسانے لکھے ہیں اور عورتوں کے مسائل کی طرف اشارے کئے ہیں۔ کرشن چندر، بیدی، عصمت چغتائی، واجدہ تبسّم اور خدیجہ مستور کے یہاں خصوصیت کے ساتھ خواتین کے بے حد اہم اور پیچیدہ مسائل ملتے ہیں۔ خواتین پر ہونے والے ظلم و تشدّد، جنسی استحصال جیسے مسائل ان تمام افسانہ نگاروں کے یہاں یکساں طور پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ سب سے بڑھکر منٹو نے عورتوں کے اُس طبقہ کے اندھیرے کمروں کے گوشوں کو روشن کیا جسے سماج کے باعزّت اور باوقار طبقہ سے تعلّق رکھنے والے مردوں نے تخلیق کیا تھا اور خود اسے اپنی ہوس کا شکار بھی بنا دیا تھا۔ منٹو کی اس ادبی جُراَت پر سماج کا وہ طبقہ تو برافروختہ ہوا ہی حکومتِ وقت بھی ان کے یہ تیور برداشت نہ کر سکی اور ان کی تحریر پر فحش نگاری کا الزام عائد کر کے قانونی چارہ جوئی تک کر دی۔

اقبال انصاری کا فن مذکورہ تمام فنکاروں سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے افسانوں میں عورت ایک نئے رُوپ میں نظر آتی ہے۔ وہ کہیں شفیق ماں ہے، کہیں زندگی سے مایوس لڑکی، کہیں رشک و حسد میں جلتی ہوئی، کہیں شکّی، کہیں زندگی کی بازی ہاری ہوئی، کہیں فاتح، کہیں محسن، کہیں دلیر، کہیں مظلوم اور نہ جانے کیا کیا جسے اقبال انصاری نے اپنے تجربوں، اپنے مشاہدوں کی آنکھ سے دیکھا ہے اور صفحۂ قرطاس پر بڑی خوبصورتی سے اُتار

دیا ہے۔ لوگوں سے سُنتا آرہا ہوں کہ عورت ایک 'پہیلی' ہے۔ اس پہیلی کی گتھیوں کو اقبال انصاری نے نہایت ہی سلیقے اور مہارت سے سُلجھانے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ اِس مجموعہ میں شامل ہر ایک کہانی عورت کی ایک ایک نفسیات کا تجزیہ معلوم ہوتی ہے۔

اقبال انصاری نہایت وسیع المطالعہ اور جہاں دیدہ بھی ہیں۔ جس کا اِعتراف ہر قاری کو کرنا چاہیے طبی اور Botanical باریکیوں کو جس طرح ان کہانیوں میں برتا گیا ہے وہ شاید ہی کسی افسانہ نگار کے یہاں ملے۔ بیماریاں اور اس کے Medical Analysis کی جو تفصیل ان کی کہانیوں میں نظر آتی ہے اس سے کوئی پیشہ ور ڈاکٹر بھی شاید انکار نہ کر سکے۔ اسی طرح پیڑ پودوں، گل بوٹوں کا جو ذکر آیا ہے، وہ قابلِ تعریف ہے۔ مختلف یورپی، افریقی اور روسی شہروں کی گلی کوچوں، بازاروں، ساحلوں اور قابلِ دید جگہوں کا جو تفصیلی ذکر آیا ہے وہ حیرت زدہ کرتا ہے۔ یہی نہیں جنوبی ہند کے دور دراز علاقوں کے رسم و رواج، سماجی حالات کا بے باکانہ ذکر افسانہ نگار کو بلند مقام عطا کر دیتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں جو ایک طلسمی فضا ملتی ہے وہ ان کی جہانگردی اور وسیع مطالعہ کے سبب ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریفیں کی جائیں کم ہے۔

اقبال انصاری کے سامنے مختلف ادبی تحریکوں کا بھی کوئی مسئلہ قطعی نہیں ہے۔ نہ ان کے یہاں ترقی پسند ادب کا کوئی نعرہ ہے اور نہ ہی جدیدیت کی ابہامی و علامتی زبان۔ ان کی زبان نہایت پُرکشش اور دل میں اُتر جانے والی ہے۔ زبان پر ان کی اتنی زبردست گرفت اِس بات کی غماز بھی ہے کہ یہ مدتوں سے افسانہ نگاری کرتے رہے ہیں۔ مگر اپنے آپ کو در پردہ رکھکر۔ ان کا منفرد طرزِ تحریر خالص بیانیہ ہے۔ بڑی سے بڑی بات بھی برجستہ کہی جائے۔

اس مجموعہ میں شامل افسانے 'وہ بکھری ہوئی عورت' 'ایک بے ہودہ سفر' اور 'انکشاف' میں دُنیا کے مختلف خوبصورت شہروں کی منظر کشی بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ اِس طرح افسانہ 'مریضِ قلب' میں علمِ طب سے آشنائی ہوتی ہے۔ افسانہ 'میگھالی' بھی اس لئے قابلِ ذکر ہے کہ کرالا کے دُور دراز علاقہ کے لیل و نہار سے متعارف ہونے کا موقعہ ملتا ہے۔

یہ افسانوی مجموعہ بلاشبہ اُردو ادب کے لئے ایک بے بہا تحفہ ہے۔ اور اس کی پذیرائی ہر حلقہ میں ہونی چاہیئے۔ اپنے دوستوں، عزیزوں اور قریبی رشتہ داروں کو دینے کے لئے اس مجموعہ سے بڑھکر دُوسرا کوئی موزوں تحفہ ہو ہی نہیں سکتا۔

ابھی ہمیں اقبال انصاری سے اور اچھے سے اچھے فن پاروں کی توقع ہے ●●●

مورخہ ۱۲ جنوری ۲۰۰۱ء کو ڈاکٹر امام اعظم کی ڈی لٹ کے زبانی امتحان کے بعد ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی کتابوں "تکونیاں" اور "لندن یاترا" کا اجراء بدست پروفیسر عبدالواسع مظفر پور اور پروفیسر حفیظ اللہ نیولپوری (اڑیسہ) بمقام پی جی شعبۂ اردو' ال ان متھلا یونیورسٹی' دربھنگا
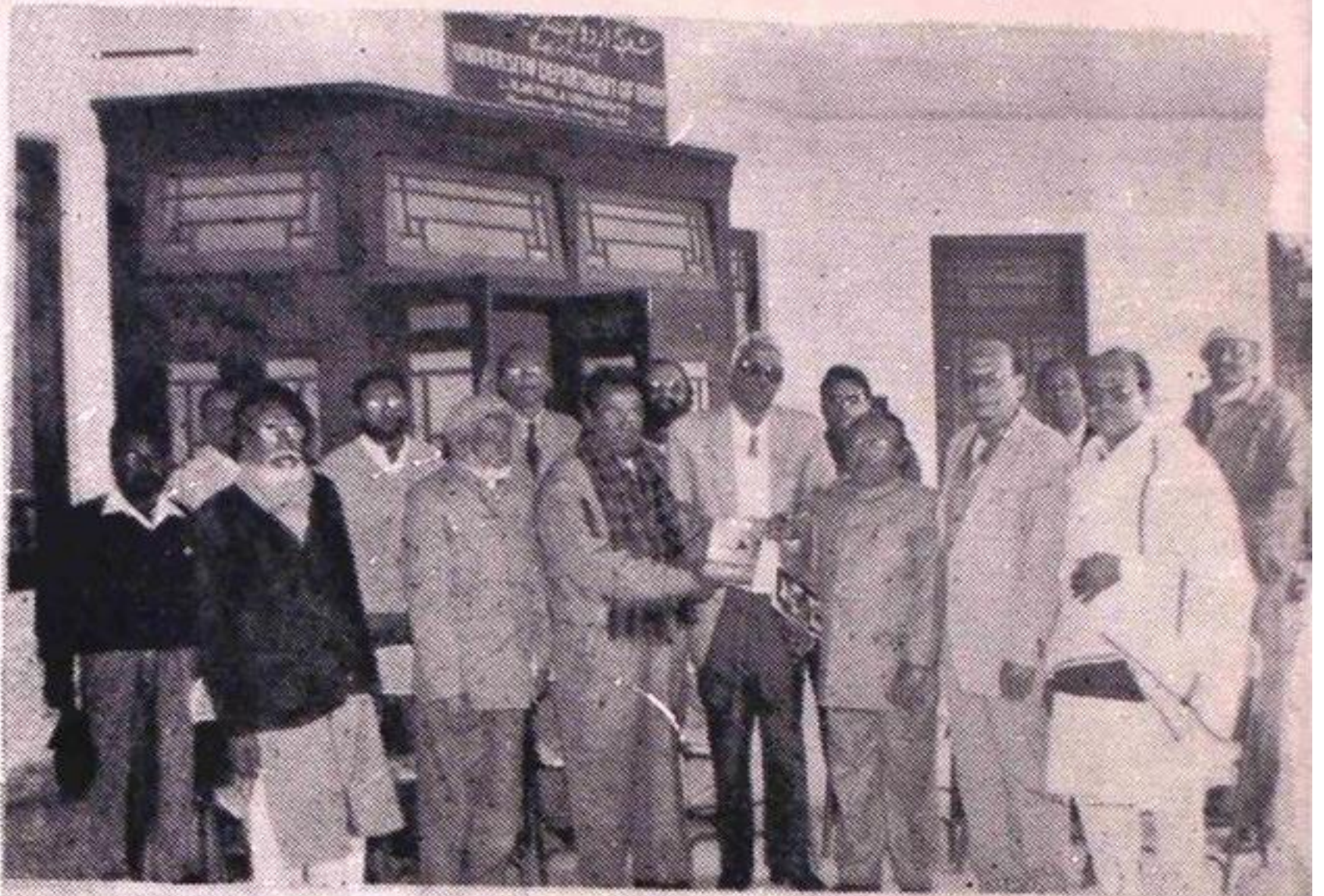
تصویر میں (اوپر اور نیچے) پروفیسر شاکر خلیق' پروفیسر حفیظ اللہ نیولپوری' پروفیسر ایم. کمال الدین پروفیسر عبدالواسع' پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی' پروفیسر سید ضیاء الرحمن' حسن امام درد ڈاکٹر فاراں شکوہ یزدانی' ڈاکٹر محمد نہال' ڈاکٹر ارشد جمیل' حسن امام فاروقی و دیگر حضرات دیکھے جا سکتے ہیں

Regd. No. 21523/22/AL/TC/88 Rs. 10/-

Vol.I. Iss.I
Quarterly

TAMSEEL-E-NAU

March to May
2001
Darbhanga

Quila Ghat, Darbhanga - 846 004 (BIHAR). Phone : 35117

EDITOR :- DR. IMAM AZAM

ایک یادگار لمحہ

قتیل شفائی کے ہمراہ ڈاکٹر امام اعظم